جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

# ترجمان القرآن

مُدیر

پروفیسر خورشید احمد

ادارہ ترجمان القرآن

# تعارف قاضی گروپ آف کمپنیز

اور اللہ ہی نے تمہارے لئے گھروں کو رہنے کی جگہ بنایا (القرآن)

قاضی انٹرپرائزز 1988 سے پراپرٹی اور کنسٹرکشن کے شعبہ سے منسلک ہیں۔ الحمدللہ جس ادارہ کی بنیاد تقویٰ، توکل، ایمانداری اور جذبہ خدمت خلق پر رکھی گئی تھی اس کو اللہ تعالیٰ نے دن دوگنی رات چوگنی ترقی سے نوازا۔ رب رحیم کا احسان عظیم ہے کہ ادارہ نے اپنے ذیلی اداروں کی محنت اور تعاون سے ترقی کی اور 1999 میں تنظیم نو کرتے ہوئے (قاضی گروپ آف کمپنیز) کا آغاز کیا۔ قاضی گروپ آف کمپنیز میں مندرجہ ذیل ادارے شامل ہیں۔

★قاضی انٹرپرائزز ★قاضی کنسٹرکشن ★قاضی پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز ★قاضی ڈویلپر ★قاضی پی وی سی پائپ انڈسٹری ★اسلامک ویلفیئر فاؤنڈیشن

## قاضی انٹرپرائزز ہی کیوں

اس لیے کہ

① ہاؤسنگ کے شعبہ میں بہترین تجربہ کار ٹیم ② 4 منصوبے مکمل کرنے کا اعزاز حاصل (جہاں یا تو ہمارے ممبران رہائش پذیر ہو چکے ہیں اور یا اپنے پلاٹ فروخت کر کے کئی گنا منافع بھی کما چکے ہیں۔ آپ بھی ہمارے منصوبوں میں سرمایہ کاری کر کے فائدہ اٹھا سکتے ہیں) ③ **منی بیک گارنٹی** ہماری ہی ہے اگر آپ تعمیر دیکھ کے مکان / پلاٹ خریدیں اور دیکھنے پر آپ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے بنائے ہوئے منصوبے معیار کے مطابق نہیں ہیں تو آپ اپنی رقم واپس لے سکتے ہیں

④ ہر اتوار کو ہماری گاڑی دفتر سے صبح نو بجے سائٹ وزٹ کے لیے روانہ ہوتی ہے اسلئے پہلے آپ سائٹ دیکھیں اور پھر خریدیں

## ہمارے منصوبے

★ الرحمن ٹاؤن (مکمل) ★ پاسبان ٹاؤن (مکمل) ★ گلستان راشد فیز (I) مکمل ★ فیملی ولاز مری فیز (I) فیز (II) مکمل

★ فیملی گارڈن اسلام آباد بکنگ جاری ★ موٹروے سٹی فیز (I) فیز (II) بکنگ مکمل ★ فیملی اپارٹمنٹ مری فیز (III) بکنگ جاری

★ موٹروے سٹی فیز (III) بکنگ جاری ★ قاضی اپارٹمنٹ راولپنڈی بکنگ جاری ★ اسلام آباد ہل گارڈن بکنگ جاری

**ہمارا دعوی ہمارے منصوبے سب سے سستے اور سب سے بہترین، دیکھیں اور فیصلہ کریں**

# موٹروے سٹی

## خصوصیات

☆اسلام آباد کی طرح سر سبز و شاداب پہاڑیوں کے دامن میں
☆نیو اسلام آباد انٹرنیشنل ایئر پورٹ کی بدولت ہر آسائش متوقع
☆ٹیکسلا، کھیوڑہ اور لوئی سندھی پارک جیسی سیر گاہیں قریب تر
☆انشاءاللہ تعالیٰ تمام ضروریات زندگی آپ کے دروازے پر
☆پاکستان موٹروے سے چند منٹ کی مسافت
☆فوج کے ریٹائرڈ افراد پر مشتمل منظم سیکورٹی سسٹم کا قیام
☆اسلامک سینٹر کے لیے پچاس کنال زمین وقف
☆قیمتوں میں اضافہ کی بدولت منافع بخش سرمایہ کاری
☆پانی جیسی نعمت کی فراوانی
☆ہر فیز میں شاپنگ سینٹر
☆کشادہ سڑکیں اور گلیاں
☆مسجد، سکول اور ہسپتال گھر کے نزدیک۔

## خصوصی رعایت

29 فروری 2000ء تک

پلاٹ بک کرانے والے کو 15 ہزار روپے فی کنال کی خصوصی رعایت

## قیمت و طریقہ ادائیگی

**قیمت:** 9 ہزار روپے فی مرلہ

**ایڈوانس:** -/1000 روپے فی مرلہ بوقت بکنگ۔

**قسط:** -/100 روپے فی مرلہ ماہانہ

**سائز پلاٹ** 5 مرلہ، 10 مرلہ، ایک کنال

تمام ادائیگی بذریعہ بنک ڈرافٹ بنام موٹروے سٹی اکاؤنٹ نمبر 8- ABL 1100 راشد منہاس روڈ برانچ راولپنڈی

یکمشت ادائیگی پر 10 فیصد خصوصی ڈسکاؤنٹ۔ کل قیمت کی پچاس فیصد یکمشت ادائیگی پر فوری رجسٹری


ہیڈ آفس **قاضی انٹرپرائزز**

جنگ بلڈنگ مری روڈ راولپنڈی

فون 554464 فیکس 558633

E-mail: shaukat@isb.comsats.net.pk

web: www.qazi.com.pk

# ماہنامہ ترجمان القرآن

جلد : ۱۳۱ ، عدد : ۹ ، ستمبر ۱۹۹۹ ، جمادی الاول ۱۴۲۰

مدیر: پروفیسر خورشید احمد

نائب مدیر: مسلم سجاد

## ترتیب




ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور

فون : ۵۴۲۵۳۵۶

فیکس : ۷۸۳۲۱۹۴

E-mail: tarjuman@pol.com.pk

مدیر انتظامی

عبدالکریم

۵- اے، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون : ۷۵۸۷۹۱۶-۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ : ۱۵ روپے

زر سالانہ : ۱۵۰ روپے

بھارت ۳۰۰ روپے

بنگلہ دیش، ایران ۴۵۰ روپے

مشرق وسطیٰ، یورپ

مشرق بعید، افریقہ ۶۵۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۹۰۰ روپے

# نیشنلزم کی حقیقت

یورپ میں جن تخیلات اور جن اصولوں پر نیشنلزم کا نشوونما ہوا ہے وہ انسانیت کی عین ضد ہیں۔ انھوں نے انسان کو حیوانیت بلکہ درندگی کے مقام تک گرا دیا ہے۔ وہ خدا کی زمین کو فساد' ظلم اور خون ریزی سے بھرنے والے' اور انسانی تہذیب کے پرامن نشو و ارتقا کو روکنے والے اصول ہیں۔ ابتدا سے خدا کے نبی جن پاک مقاصد کے لیے سعی کرتے رہے ہیں' یہ اصول ان سب پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ الٰہی شریعتیں جن اغراض کے لیے دنیا میں آئی ہیں' اور آسمانی کتابیں جن اخلاقی و روحانی تعلیمات کو لے کر نازل ہوئی ہیں' یہ شیطانی اصول ان کے مدمقابل' ان کے مزاحم اور معاند واقع ہوئے ہیں۔ یہ انسان کو تنگ دل' تنگ نظر (قوم پرستانہ تنگ نظری کی انتہا یہ ہے کہ جاپان میں ہندستان کے آم کا داخلہ بند ہے۔ گویا ایک نعمت جو اللہ نے زمین پر پیدا کی ہے' ایک قوم کے لوگ اپنے اوپر اس کو صرف اس لیے حرام کر لیتے ہیں کہ وہ دوسری قوم کے ملک میں پیدا ہوئی) اور متعصب بناتے ہیں۔ یہ قوموں اور نسلوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا کر حق اور انصاف اور انسانیت کی طرف سے اندھا کر دیتے ہیں۔ یہ مادی طاقت اور حیوانی زور کو اخلاقی حق کا قائم مقام قرار دے کر شرائع الٰہیہ کی عین بنیاد پر ضرب لگاتے ہیں۔

الٰہی شریعتوں کا مقصد ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ انسانوں کے درمیان اخلاقی اور روحانی رشتے قائم کر کے انھیں وسیع پیمانے پر ایک دوسرے کا معاون بنایا جائے' مگر نیشنلزم نسلی اور وطنی امتیاز کی قینچی لے کر ان رشتوں کو کاٹ دیتا ہے اور قومی منافرت پیدا کر کے انسانوں کو ایک دوسرے کا معاون بنانے کے بجائے مزاحم اور معاند بنا دیتا ہے۔

الٰہی شریعتیں چاہتی ہیں کہ انسان اور انسان کے درمیان آزادانہ ربط کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کیے جائیں کیونکہ انھی پر انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی کا انحصار ہے' مگر نیشنلزم ان روابط کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں پیدا کرتا ہے حتیٰ کہ ایک قوم کے حلقہ اثر میں دوسری قوم والوں کے لیے سانس لینا تک مشکل کر دیتا ہے (ابوالاعلیٰ مودودی' "مغربی نیشنلزم اور فرنگی لباس" ترجمان القرآن' ج ۱۵' عدد ۱' رجب ۱۳۵۸ھ' ستمبر ۱۹۳۹ء' ص ۶۴-۶۵)۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

# فیصلے کی گھڑی

## یا تن رسد بہ جاناں یا جاں ز تن بر آید!

پروفیسر خورشید احمد

قرآن پاک اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے افراد کے فکر و عمل اور تہذیب و تمدن کے فروغ و ارتقا میں انقلابی کردار ادا کیا ہے۔ یہ ایک جاری عمل ہے جو دو چیزوں سے عبارت ہے۔ اول' وہ حقائق' عقائد' اقدار' اصول' احکام اور نصائح جن کا خزینہ قرآن و سنت ہے اور جو زندگی کا ایک مخصوص' مکمل اور ہمہ گیر تصور' قلب و نگاہ میں جاگزیں کر دیتے ہیں۔ اور دوسرے' غور و فکر' سوچ بچار' تحلیل و تجزیہ' استنباط و استقرا اور تطبیق و تجربے کا وہ اسلوب اور طریق کار جس کی قرآن و سنت نے تعلیم دی' جس کی تربیت کا نمونہ اور منبع خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا اور جس نے ملت اسلامیہ کو ایک تاریخ ساز اور تہذیب گر قوت میں تبدیل کر دیا۔

امت مسلمہ کی ترقی اور تازگی کے یہ دو لازوال سرچشمے ہیں جن کے ذریعے وہ ہر دور اور ہر زمانے کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے اور تشکیل نو کے مقاصد حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

قرآن حکیم نے جس طرح ماضی کی اقوام کے کردار اور ان کے تاریخی عروج و زوال پر تبصرہ کیا ہے اور جس طرح خود نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ دعوت اور تحریک کے مختلف مراحل پر گفتگو کی ہے' خصوصیت سے غزوات نبوی کا جس انداز میں تجزیہ فرمایا ہے' وہ ہر دور کے واقعات کے تحلیل اور تجزیے کے لیے ایک نمونہ ہے۔ غزوۂ بدر کی کامیابیاں ہوں یا غزوۂ احد کی ملی جلی کیفیات' خندق کا معرکہ ہو یا حدیبیہ کے مذاکرات' موتہ سے حکیمانہ واپسی ہو یا تبوک کی معرکہ آرائی' مکہ کی فتح ہو یا حنین کی پریشانی--- سب پر قرآن نے بڑے نپے تلے انداز میں مثبت اور منفی' ہر پہلو سے کلام کیا ہے اور خود احتسابی

اور اجتماعی احتساب کے اصول و ضوابط کے ضروری خدوخال ہمیشہ کے لیے نمایاں اور واضح کر دیے ہیں۔ فتح ہو یا شکست، کامیابی ہو یا ہزیمت، جب بھی مسلمانوں نے اس ماڈل کے مطابق اپنا جائزہ لیا ہے اور آیندہ کے لیے تیاری کی ہے، وہ کامیاب رہے ہیں، اور جب بھی انھوں نے اس جادہ حق سے انحراف کیا ہے یا اغماض برتا ہے تو انھوں نے منہ کی کھائی ہے۔

پاکستان آج ایک ایسے نازک تاریخی موڑ پر کھڑا ہے اور فیصلے کی گھڑی ایک لمحے کی بھی تاخیر کی مہلت نہیں دیتی۔ ویسے تو پورے ۵۲ سال کا کچا چٹھا سب کے سامنے ہے اور بہتری کی چند لہروں کو چھوڑ کر غلطیوں اور ناکامیوں کا ایک تسلسل ہے جو قوم کی پیٹھ پر لدا ہوا ہے لیکن حالیہ واقعات نے فیصلے کی گھڑی کو بہت ہی قریب کر دیا ہے۔ ۲۸ مئی ۱۹۹۸ کی تاریخی کامیابی اور مئی ۱۹۹۹ کے آخر میں کارگل کے بعد ۴ جولائی کا جرأت و شجاعت اور کامیاب محاذ سے شرمناک پسپائی، بھارت سے مذاکرات کی جھپٹ، رن آف کچھ میں ۱۰ اگست کی بھارتی جارحیت کے نتیجے میں پاک بحریہ کے جہاز کی تباہی اور ۱۶ جوانوں کی شہادت، بھارتی وزیراعظم کا ۱۵ اگست کو اپنی فوجوں کو چوکس رہنے کا اور ۱۷ اگست کو کشمیر اور پاکستان کے خلاف جارحیت کے اعلان، اور پاکستان سے مذاکرات سے انکار اور ان سب پر پاکستان کے غیور مسلمانوں کا غصہ اور اضطراب ـــ یہ وہ حالات ہیں جو تقاضا کرتے ہیں کہ قرآنی اسلوب تجزیہ و احتساب کی روشنی میں قیادت اور اس کی حکمت عملی کا بے لاگ جائزہ لیا جائے اور مستقبل کی ضرورتوں کی درستی کے لیے ایک موثر لائحہ عمل کسی تاخیر اور غفلت کے بغیر مرتب کیا جائے۔

آج ہم جس مقام پر پہنچ گئے ہیں وہ ایک تاریخی موڑ ہے۔ اصل سوال اب پاکستان اور ملت اسلامیہ پاکستان کی بقا، اس کی آزادی اور نظریاتی وجود کی حفاظت اور ملت اسلامیہ کی عزت اور غیرت کا ہے۔ یہ موت و حیات کے فیصلے کی گھڑی ہے، محض وقتی سیاسی یا معاشی مصالح کی بات نہیں! قرآنی اصولوں اور تاریخی تجربات کی روشنی میں قوم کے لیے کھل کر اپنا راستہ طے کرنے کا نازک لمحہ آگیا ہے۔ اگر اب بھی ہم فیصلہ کرنے اور ایک واضح راستہ اختیار کرنے میں ناکام رہتے ہیں تو پھر خدانخواستہ "ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں"۔ اور اگر صحیح فیصلہ، پختہ عزم اور صحیح حکمت عملی اختیار کر لیتے ہیں تو حالات یکسر تبدیل ہو سکتے ہیں۔ اس کے لیے ایک ایسے ارادے، ایک ایسے عزم اور ایک ایسے فیصلے کی ضرورت ہے جیسا طارق بن زیاد نے ہسپانیہ کے ساحلوں پر پہنچ کر کیا تھا:

دست از طلب ندارم تا کار من بر آید
یا تن رسد بہ جاناں یا جاں ز تن بر آید

اور اگر آج ملت اسلامیہ پاکستان صحیح فیصلہ کر کے اس کے لیے جان کی بازی لگا دیتی ہے تو اللہ کا وعدہ آج

بھی اسی طرح پورا ہو گا جس طرح ہر دور میں ہوتا رہا ہے ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

------------------

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند لمحات سورہ اٰل عمرٰن کی آیات (۱۲۱ تا ۱۴۴) کی روشنی میں اپنے حالات کا جائزہ لینے کے لیے صرف کریں جن میں زمین و آسمان کے مالک اور فتح و شکست کا اصل فیصلہ کرنے والے نے غزوۂ احد کے مختلف مراحل' نتائج اور کارفرما اسباب پر تبصرہ کیا ہے۔ ان آیات پر تدبر کی نگاہ ڈالنے سے چند اصول سامنے آتے ہیں جن کا اطلاق صرف احد ہی پر نہیں ہر دور اور ہر معرکہ پر ہوتا ہے۔

۱۔ فتح و شکست اللہ رب العزت کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے ہر حال میں اس کی رسی کو تھامنا' اس کی طرف رجوع کرنا' اس کے احکام کی پاس داری' اس کے راستے سے انحراف سے بچنا اور اس سے استعانت طلب کرنا مسلمان کا شعار ہے۔ دوسرے سہاروں پر انحصار' مسلمان کی کمزوری اور اللہ پر بھروسا' مومن کا ہتھیار اور قوت کا راز ہے۔

۲۔ دنیاوی معرکوں میں کامیابی اور ناکامی کے مادی اور اخلاقی اسباب بھی ہوتے ہیں جن کا ادراک ضروری ہے اور جن سے صرف نظر جیتی ہوئی بازی کے ہار جانے اور جن کی پاس داری شکست اور ہزیمت کو فتح و کامرانی میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان مادی اسباب اور ذرائع کے ساتھ اخلاقی اور نظریاتی پہلوؤں کا لحاظ ازبس ضروری ہے۔ قرآن کا فیصلہ ہے کہ مادی اور اخلاقی کمزوریوں کے تدارک کے بغیر اچھے نتائج کی توقع عبث ہے۔ البتہ مسلمان کے لیے جہاں مادی اسباب کا احاطہ اور وسائل کا حصول ضروری ہے' وہیں صرف ان پر انحصار کافی نہیں۔ مادی وسائل کے ساتھ ایمان کی قوت' اللہ کے وعدے پر بھروسا' نظام امر کی سمع و طاعت اور خود اپنی اخلاقی قوت کا استحکام نہ صرف ضروری ہے بلکہ فیصلہ کن ہے۔

۳۔ جس طرح کامیابیاں ایک حقیقت ہیں' اسی طرح ناکامیاں بھی انسانی زندگی کا حصہ ہیں۔ سیاسی' معاشی اور عسکری نشیب و فراز سب [illegible] ہیں۔ ان سے نہ ہمت ہارنی چاہیے اور نہ ان سے متاثر ہو کر اپنے اصولی راستے سے ہٹنے اور حق کے باب میں کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کا سوچنا چاہیے۔ لڑائی میں پیش قدمی یا پسپائی دونوں کا امکان ہے اور ہر پسپائی کے بعد پیش قدمی کے مواقع موجود رہتے ہیں بشرطیکہ دل و دماغ شکست قبول نہ کریں۔ اصل ناکامی اور نامرادی حق سے پسپائی اور مایوسی ہے جس سے بچنا مسلمانوں کی اولیں ترجیح ہونا چاہیے۔

۴۔ اگر کبھی ناکامی' شکست یا ہزیمت سے سابقہ ہو تو اس پر پردہ نہیں ڈالنا چاہیے اور نہ خود کو دھوکا

دینے کی حماقت کرنی چاہیے۔ حقائق سے فرار سب سے بڑی بزدلی اور بداندیشی ہے۔ خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں عسکری میدان میں نشیب و فراز واقع ہوئے اور قرآن نے کامیابی اور پسپائی' فتح اور چوٹ کھانے کا کھلے طور پر اعتراف کیا۔ اور حقائق جیسے کہ وہ ہوں' ان کو تسلیم کر کے حالات کا مقابلہ کرنے کی حکمت سکھائی اور بتایا کہ اسباب کا کھوج لگائیں اور ان کی روشنی میں اصلاح کا لائحہ عمل تیار کریں۔

۵۔ ناکامی بلاشبہ ایک تکلیف دہ عمل ہے لیکن اس شر سے بھی خیر رونما ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس سے صحیح سبق سیکھا جائے۔ معرکہ احد کے ذریعے جو سبق مسلمانوں کو سکھایا گیا اس میں مادی اور دنیوی طمع کے خطرات سے آگاہی' اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حکم عدولی کے نتائج' اور اپنی صفوں میں اہل حق کے ساتھ اہل شر' مسلمانوں اور مسلمانوں کا سالبادہ اوڑھنے والوں کے گڈمڈ ہو جانے کو مرکزی اہمیت دی گئی ہے۔ ناکامی کی جو مصلحت بتائی گئی ہے وہ سچوں اور جھوٹوں میں تمیز اور وفاداروں اور مفاد پرستوں کو ایک دوسرے سے ممیز کر دینا ہے تاکہ دھوکا دینے والوں سے نجات پائی جا سکے اور دوست اور دشمن میں تمیز ہو سکے۔ احد کا پیغام یہ بھی ہے کہ صرف ان دشمنوں ہی کو دشمن نہ سمجھا جائے جو باہر سے مدمقابل ہوں بلکہ ان دشمنوں اور جفاکاروں سے بھی نجات حاصل ہو جائے جو اپنی صفوں میں گھسے ہوئے ہیں۔ کامیابی تو اہل ایمان ہی کے لیے ہے بشرطیکہ وہ حقیقی معنوں میں صاحب ایمان ہوں۔ نیز اہل ایمان اور محض دعوائے ایمان کرنے والوں کو ایک دوسرے سے ممیز کرنا بھی الٰہی حکمت عملی کا ایک اہم حصہ ہے۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ط وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ج وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ط وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ○ (ال عمرٰن ۳: ۱۳۹-۱۴۰) دل شکستہ نہ ہو' غم نہ کرو' تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ اس وقت اگر تمھیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمھارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لیے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں' اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (راستی کے) گواہ ہوں--- کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں۔

اور صاف متنبہ کر دیا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ○ (ال عمرٰن ۳: ۱۴۲) کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔

ان پانچ اصولوں کے ساتھ اگر وہ بنیادی حقیقت سامنے رہے جس کا اظہار سورۃ مجادلہ میں کیا گیا ہے تو تجزیہ، تحلیل، نئی منصوبہ بندی اور متبادل حکمت عملی کے سارے نقوش واضح ہو جاتے ہیں۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ط اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ط وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ط اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ط اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (المجادلہ ۵۸: ۲۲) تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے، خواہ وہ ان کے باپ ہوں، یا ان کے بیٹے، یا ان کے بھائی، یا ان کے اہل خاندان۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کو قوت بخشی ہے۔ وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں۔ خبردار رہو، اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں۔

---

مسلمانوں کی پوری تاریخ ایسی روشن مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ جب بھی آزمایش کی گھڑی، سخت گھڑی آئی اور اہل ایمان نے اللہ سے رجوع کیا اور صحیح حکمت عملی اختیار کی تو نئی کامیابیوں اور کامرانیوں نے ان کے قدم چومے اور انھوں نے تاریخ کا دھارا بدل کر رکھ دیا۔ موقع کی مناسبت سے خود برعظیم کی تاریخ کی دو مثالیں اس وقت سامنے رکھنے کے قابل ہیں:

پہلی مثال، سلطان شہاب الدین غوری کی ہے جس نے پرتھوی راج کے ہاتھوں ۱۱۹۱ میں شکست کھائی لیکن ہمت نہ ہاری۔ اس نے قسم کھائی اور ہر لذت اپنے اوپر حرام کر لی حتیٰ کہ وہ کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے جنھیں پہنے ہوئے وہ میدان جنگ میں شکست سے دوچار ہوا تھا اور جن پر خون کے دھبے تھے۔ تین ہی سال کے بعد وہ پھر ایک لشکر جرار لے کر معرکہ آزما ہوا مگر اس فرق کے ساتھ کہ پہلے اس کا لشکر محض غوریوں پر مشتمل تھا اور اب اس میں صرف اسلام کی بنیاد پر تمام لوگ شامل تھے۔ اس نے مسلمانوں کو اذن عام دیا تھا کہ محض نسل اور قبیلے کی بنیاد پر نہیں بلکہ اسلامی جہاد کی بنیاد پر میدان میں اتریں۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اب یہ جنگ، جنگ ملوکیت نہیں تھی، جہاد تھا جو اسلام کے پرچم تلے لڑا گیا اور اپنے سے تین گنا زیادہ بڑی فوج کو شکست دے کر برعظیم میں اسلامی دور کے آغاز کا ذریعہ بنا۔ یہ ہے وہ بنیاد جس پر "غوری"، "پرتھوی" کا توڑ کر سکتا ہے!

دوسری مثال، ظہیرالدین بابر کی ہے۔ رانا سانگا سے مقابلے میں سخت ہزیمت اٹھانے اور اپنوں کی بے

وفائی کا زخم کھانے کے بعد بھی بابر مایوس نہ ہوا۔ حالات کا جائزہ لیا، اپنی غلطیوں کا محاسبہ کیا، اللہ سے توبہ کی، شراب کے برتن توڑ دیے اور سونا چاندی غریبوں میں تقسیم کر دیا۔ غیر شرعی محاصل کو یک لخت ختم کیا، فوج کی نئی صف بندی کی، نئے آلات حرب خصوصیت سے بارودی توپ کو فوجی دروبست میں شامل کیا، اور اس امر کا برملا اعلان کیا کہ "یہ جنگ توسیع مملکت کے لیے نہیں، حصول ثواب اور جہاد کے لیے ہے"۔

افواج میں ایک نیا جذبہ پیدا ہوا۔ لوگوں کے دلوں سے موت کی دہشت کافور ہو گئی اور ایک بلند مقصد کے لیے جان دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ سب نے قرآن ہاتھ میں لے کر عہد کیا کہ مر جائیں گے لیکن میدان جنگ سے پیٹھ نہ پھیریں گے۔ گھمسان کا رن پڑا اور بالآخر مسلمان غالب اور کامران رہے اور برعظیم میں مغلیہ دور کا آغاز ہوا۔

جنگوں کا فیصلہ بظاہر تو میدان کارزار میں ہی ہوتا ہے، فی الحقیقت اصل فیصلہ قیادت کے دل و دماغ میں ہوتا ہے۔ جو ذہن محض معاش اور مفاد کے چکر میں ہوتے ہیں اور جو اعلیٰ مقاصد کے لیے جینے اور مرنے کی لذت سے محروم ہیں، وہ لڑنے سے پہلے ہی بازی ہار جاتے ہیں اور ذلت کا نشان بن جاتے ہیں۔

آج پاکستان کی قیادت نے بھی جس ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے وہ شکست خوردگی اور نفع عاجلہ کی طلب کی ذہنیت ہے۔ وہ یہ بھول گئی ہے کہ ؎

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

---

ہم حالات کے بے لاگ تجزیے کے بعد اس تلخ لیکن مبنی برحقیقت نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس وقت ملک کے سامنے مستقبل کے دو واضح نقشے اور راستے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو شعوری طور پر قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ کفر اور اسلام دونوں کے لیے تاریخ میں مقام ہے لیکن نفاق اور دوغلے پن کے لیے عزت کا کوئی مقام نہیں۔ ہمیں سب سے پہلے تو اس دو رخے پن کو ترک کرنا ہو گا کہ "با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد"۔ بیک وقت اللہ اور شیطان کو خوش نہیں کیا جا سکتا۔ دوغلے پن اور انگریزی محاورے میں ایک ہی سانس میں نرم و گرم کی سعی، لاحاصل ہے۔ جو راستہ بھی اختیار کریں کھل کر اختیار کریں اور پھر اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔ یہ پہلی ضرورت ہے۔

دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ اب قوم کے سامنے جو دو راستے ہیں وہ بالکل واضح ہیں۔ ایک راستہ بظاہر معاشی ترقی، بھارت سے دوستی اور امریکہ کی کیمپ برداری اور فی الحقیقت ذلت، محکومی اور غلامی کا راستہ ہے اور دوسرا سخت کوشی، قربانی، خود انحصاری، جہاد، اللہ کی اطاعت شعاری اور امت مسلمہ کی بازیابی

کا راستہ ہے جو مشکل ہے اور قربانی اور مشقت طلب ہے لیکن عزت' آزادی اور حقیقی کامیابی کا راستہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان نہ کوئی سمجھوتہ ممکن ہے اور نہ ان کا کوئی ملغوبہ تیار ہو سکتا ہے۔ فیصلہ اور انتخاب ان دونوں کے درمیان کرنا ہے اور کھلی آنکھوں سے کرنا ہے۔ پھر جو فیصلہ بھی قوم کرے اس پر ڈٹ جانا ہے۔ اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔

مسلم لیگ کی موجودہ حکومت ہو یا پیپلز پارٹی کی قیادت' اس بارے میں دونوں کے درمیان کوئی جوہری فرق نہیں۔ کشمیر کا مسئلہ ہو یا بھارت سے تعلقات کی نوعیت' معاشی ترقی کا آہنگ ہو یا انتظامی امور اور طرز حکمرانی (style of governance)' سودی معیشت اور سرمایہ دارانہ نظام کی بات ہو یا آزاد تجارت اور نام نہاد عالم گیریت (globalisation) کی' عسکری قوت کے استحکام کا مسئلہ ہو یا ایٹمی صلاحیت کی حفاظت اور ترقی کا' دینی حمیت اور اسلام سے وفا شعاری کا معاملہ ہو یا مغرب کی خوشنودی اور نقالی کا' امریکہ کی بالادستی قبول کرنے کا سوال ہو یا آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کی کاسہ لیسی کا' مفاد پرستی' اقربا پروری' میرٹ کے خون اور کرپشن کی بات ہو یا ذاتی اور خاندانی مراعات اور مفادات کا حصول--- دونوں نام نہاد بڑی پارٹیوں اور ان کی قیادتوں نے خاص طور پر گذشتہ ۱۰ برسوں میں جس منفی کارکردگی اور تخریبی صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے' اس سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ ان کے ہاتھوں میں ملک' اس کی آزادی اور اس کی امانتیں محفوظ نہیں ہیں۔

بظاہر یہ ایک دوسرے پر تنقید کرتے ہیں لیکن فی الاصل دونوں کا رنگ و آہنگ یکساں ہے۔ اسے خاص طور پر کشمیر کے معاملے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دونوں نے جہاد کشمیر کے باب میں زبانی جمع خرچ میں تو ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی لیکن فی الحقیقت جہادی قوتوں کی پشت میں خنجر پیوست کیا' حق خود ارادیت کی مرکزیت اور کشمیر کی حقیقی قیادت کے کلیدی کردار کی نفی کی اور ساری بحث و گفتگو کا محور اب صرف "دو طرفہ بات چیت" اور "کنٹرول لائن کی عصمت اور تقدیس" ہے۔

بے نظیر صاحبہ نے عین کارگل کے معرکے کے دوران کنٹرول لائن کھولنے اور ایک مدت کے بعد دو طرفہ الیکشن کی جس امریکی لائن کی تائید اور تلقین کی' اب اسی بات کی جگالی وزیر خارجہ ذرا دوسرے انداز میں کارگل کی پسپائی کے بعد کر رہے ہیں۔ بھارت سے تجارت اور دوستی کا جو عشق وزیراعظم صاحب کو ہے' بے نظیر صاحبہ اس کا دوسرے لفظوں میں اظہار "جنوبی ایشیا کی مشترکہ منڈی" کے عنوان سے کر رہی ہیں۔ دونوں فوجی صلاحیت کے استحکام کا مقابلہ روٹی' کپڑے اور مکان کے سبز باغ سے کر رہے ہیں اور اس طرح بات کی جا رہی ہے جیسے فوجی اخراجات کم کر کے دودھ اور شہد کی نہریں بہا دیں گے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ آزادی کی حفاظت کی صلاحیت سے محروم ہونے کے بعد معاشی ترقی نہیں' سیاسی غلامی مقدر ہو

جاتی ہے۔

بھارت سے دوستی، امریکی بالادستی کا بہ رضا و رغبت استقبال، "اسلامی بنیاد پرستی" اور "مذہبی تشدد" (religious terrorism) کا ہوا دکھا کر اپنی میانہ روی اور لبرل ازم کی تشہیر، ایٹمی اور عسکری صلاحیت کی تخفیف کے دعوے، عالمی معیشت میں ضم ہونے (global integration) کا عہد اور مغرب کے ثقافتی رنگ میں رنگ جانے کا عزم---- یہ ہیں وہ عناصر جن سے موجودہ قیادت اور پی پی کی سربراہ کا تصور پاکستان عبارت ہے۔ زمینی حقائق، امت مسلمہ کے عقائد اور عزائم، اور تحریک پاکستان کے مقاصد سے ان کو کوئی سروکار نہیں۔ ان کے سامنے صرف ایک ہدف ہے--- ذاتی مفاد اور مادی خوش حالی!

یہ سمجھتے ہیں کہ ان اہداف کے حصول کے لیے بھارت سے دوستی اور امریکہ کی سرپرستی ضروری ہے۔ دین اور دینی قوتیں اس کی راہ میں حائل ہیں۔ جہاد کشمیر ان کے گلے کی ہڈی بن گیا ہے کہ نہ نگل سکتے ہیں اور نہ اگل سکتے ہیں۔ اسی لیے اسے کنٹرول لائن کی بھینٹ چڑھا دینا چاہتے ہیں۔ جہادی قوتیں اور فوج ایک خطرہ ہے اس لیے انھیں کمزور کرنا اور راستے سے ہٹانا مقصود ہے۔ وزیراعظم صاحب نے اپنے اعلان واشنگٹن کے دفاع کی تقریر میں سب سے بڑی دلیل یہ دی ہے کہ جنگ سے بچنا اور فوجی مصارف کم کرنا اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر معاشی خوش حالی ممکن نہیں۔ حالانکہ وہ بھول گئے کہ بجٹ پر سب سے بڑا بوجھ اس سود کا ہے جس پر مبنی قرضوں کے پہاڑ تلے انھوں نے اور ان کے ہم نواؤں نے، ملک و قوم کو گروی رکھ دیا ہے۔ یہ ظلم اسی معاشی ترقی اور خوش حالی کے نام پر کیا گیا ہے جس پر اب بھارت سے دوستی، امریکہ کی محکومی اور فوجی صلاحیت سے نجات کی باتیں کی جا رہی ہیں۔

--------------------

کارگل، کشمیر، بھارت سے مذاکرات اور امریکہ کی کاسہ لیسی نے اس ماڈل کے نقش و نگار بالکل واضح کر دیے ہیں جس کے مطابق موجودہ قیادت پاکستان کا حلیہ بگاڑ رہی ہے۔ اب ان تلخ حقائق پر کوئی ملمع نہیں چڑھایا جا سکتا۔ اس گروہ کے اقتدار کا جاری رہنا اس تصور پاکستان کی موت ہے جو اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے قوم کے سامنے پیش کیا اور جس کی خاطر ملت اسلامیہ ہند نے بیش بہا قربانیاں دے کر یہ ملک حاصل کیا تھا۔

اگر ہمیں پاکستان کو اس کے اصل مقاصد اور تصور کے مطابق تعمیر کرنا ہے تو موجودہ قیادت کے تصور پاکستان کے خلاف بالکل دو ٹوک انداز میں جہاد کرنا ہو گا اور قوم کو اپنی موجودہ قیادت سے نجات حاصل کر کے پاکستان کی اس تصور کے مطابق تعمیر و استحکام کی جدوجہد کرنا ہو گی جس کے نتیجے میں یہ ملک ایک آزاد اور باغیرت قوم کا مسکن بن سکے اور یہاں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عدل و انصاف اور نیکی اور معروف پر مبنی معاشرہ اور ریاست قائم کیے جا سکیں۔ اس کے

لیے اس ورلڈ ویو سے اعلان برأت ضروری ہے جو امریکہ اس وقت پوری دنیا اور خصوصیت سے مسلم دنیا پر قائم کرنا چاہتا ہے اور جس میں بھارت اس کا شریک اور حلیف ہے۔

امریکی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے اعلیٰ مشیر میتھیو پی ڈیل (Mathew P. Dale) نے واشنگٹن میں ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کارگل کے بعد کی صورت حال سے متعلق امریکہ، بھارتی گٹھ جوڑ کا صاف لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے:

The intellectual construct of an even-handed balanced policy between India and Pakistan has been given up, if it ever existed. (Daily Dawn, 7 Aug 1999)

(ترجمہ) بھارت اور پاکستان کے درمیان ایک متوازن برابر کی پالیسی کا تصور، اگر کبھی تھا بھی، تو اب ختم ہو چکا ہے۔

اور ایک دوسرے سرکاری ترجمان نے کہا ہے:

US relationship with India would be qualitatively stronger in the coming half century, compared to the preceeding fifty years.

(ترجمہ) آنے والی نصف صدی میں بھارت کے ساتھ امریکہ کے تعلقات گزشتہ نصف صدی کے مقابلے میں حقیقتاً مضبوط تر ہوں گے۔

بھارتی وزیراعظم کے ۱۵ / اگست ۱۹۹۹ کے اس اعلان سے کہ جب تک کشمیر میں گڑبڑ ہے، پاکستان سے کوئی بات چیت نہیں ہو سکتی اور یہ کہ بھارتی حکومت ایٹمی میزائل اپنی فوج کے حوالے کر رہی ہے، ہوا کا رخ صاف ظاہر ہو گیا ہے۔ اب ایک راستہ بھارت اور امریکہ کی بالادستی کو تسلیم کرنے اور معاشی خوش حالی کے نام پر سیاسی آزادی، نظریاتی تشخص اور عسکری صلاحیت کو قربان کرنے کا ہے، اور دوسرا آزادی، ایمان اور عزت کی حفاظت اور اس کے لیے عیش و عشرت کو خیرباد کہنے، سخت کوشی اور جدوجہد کرنے، پیٹ پر پتھر باندھنے لیکن دین و ایمان اور آزادی اور عزت کا سودا نہ کرنے کا راستہ ہے۔

موجودہ قیادت نے تمام چرب زبانی اور دوغلے پن کے باوجود اپنی اصل منزل اور ترجیحات کو صاف ظاہر کر دیا ہے۔ اگر اس گڑھے سے بچنا ہے اور اس قیادت کے ہدف کے مقابلے میں دوسرا راستہ اختیار کرنا ہے تو اس کے لیے:

○ اس قیادت سے نجات، اور

○ ایک ایسی قیادت کو بروے کار لانا ضروری ہے جو اس تصور پاکستان کی حامی اور علم بردار ہو جس کا خواب اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے دیکھا تھا اور جس نے تحریک پاکستان کے شرکا کے خون کو گرمایا تھا، جس پر یہ اعتماد کیا جا سکے کہ وہ ان خطوط پر پاکستان کی تعمیرنو کرنے کی اہلیت اور عزم رکھتی ہے۔

اس وقت اصل مسئلہ ایک ناکام اور بے وفا قیادت سے نجات اور ایک ایسی قابل اطمینان متبادل

قیادت کو برسراقتدار لانا ہے جو متبادل نظام قائم کر سکے۔

---

ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اگر قیادت میں حقیقی انقلاب نہیں آتا تو پاکستان اس دلدل سے نہیں نکل سکتا جس میں وہ پھنس چکا ہے۔ مفاد پرستوں کا ایک ہی ٹولہ ہے جو چولے بدل بدل کر برسراقتدار رہا ہے اور اگر انتخابات کے نظام میں بنیادی تبدیلیاں نہیں ہوتیں تو اس ٹولے کا کوئی گروہ پھر اوپر آ سکتا ہے۔ اس لیے جن چیزوں کا اہتمام ضروری ہے ان میں نظام انتخاب کی تبدیلی، اور ان تمام عناصر کا بے لاگ اور شفاف احتساب ہے جو برسراقتدار رہے ہیں اور حالات کو بگاڑنے کے ذمہ دار ہیں۔

نئی قیادت کو عوام میں سے ہونا چاہیے اور عوام کے سامنے جواب دہ ہونا چاہیے۔ حکمران طبقات کے درمیان جو میوزیکل چیرز (musical chairs) کا کھیل کھیلا جاتا رہا ہے اسے اب ختم ہونا چاہیے۔ اسے ختم کیے بغیر کسی روشن مستقبل کی توقع حقیقت پر مبنی فعل نہیں ہوگا۔ بلاشبہ تبدیلی جمہوری اور قانونی ذرائع ہی سے آنی چاہیے لیکن اس کے لیے دستور اور قانون میں جن تبدیلیوں کی ضرورت ہے، ان کا اہتمام بھی عوامی تحریک کے ذریعے ہی ہونا چاہیے جیسا کہ بنگلہ دیش میں گذشتہ انتخابات سے قبل ہوا۔

سوال اٹھایا جاتا ہے کہ تیسری قوت کہاں ہے؟ ہماری نگاہ میں یہ سوال غیرفطری اور نظام ظلم کو باقی رکھنے والوں کا ایک حربہ ہے۔ اللہ نے اس ملک کی امانت پاکستان کے ساڑھے تیرہ کروڑ مسلمانوں کو سونپی ہے، کسی فاجر طبقے یا گروہ کو نہیں۔ تقسیم سے قبل انگریز اور کانگریسی یہی کہتے تھے کہ ملک میں صرف دو قوتیں ہیں۔ مسلمان کہاں ہیں؟ لیکن قائداعظمؒ نے اسے چیلنج کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مسلمان ایک قوت بن کر تحریک پاکستان کی شکل میں اُفق پر چھا گئے۔

آج بھی جو لوگ یہ سوال کر رہے ہیں وہ یہ بھول گئے ہیں کہ اصل قوت ملک کے عوام ہیں، محض برسراقتدار طبقات نہیں۔ یہ طبقات اپنی افادیت اور اپنی ساکھ کھو چکے ہیں۔ وہ اس کھوکھلے درخت کی مانند ہیں جسے اندر کا گھن کھا گیا ہو اور جس کی ثمرآوری بانجھ ہو گئی ہو۔ ان حالات میں نئی قوت کا ابھرنا ہی فطرت کا تقاضا اور تاریخ کا فیصلہ ہے۔

---

جماعت اسلامی پاکستان نے تبدیلی قیادت اور نئے نظام کے لیے ملک گیر تحریک شروع کر دی ہے۔ جماعت اسلامی، تحفظ پاکستان اور اسلام کے اصول انصاف کے تمام بہی خواہوں کو ساتھ لے کر ایک متحدہ قوت کی حیثیت سے اس جدوجہد کو برپا کرنا اور کامیابی تک لے جانا چاہتی ہے۔ البتہ اس کے لیے صرف منفی اہداف پر اتفاق رائے کافی نہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مثبت تبدیلی اور مطلوبہ نظام کے بارے

میں بھی اتفاق اور تعاون ہو۔ اس کے لیے جن چیزوں پر اتفاق و اتحاد ضروری ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ پاکستان اور نظریہ اسلام لازم و ملزوم ہیں۔ اسلام نیکی، معروف اور انصاف کی بنیادوں پر پوری زندگی کا نقشہ تعمیر کرتا ہے۔ یہ مقصد صرف قرآن و سنت کی بالادستی کے قیام ہی کے ذریعے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس پر خلوص اور دیانت سے عمل ہماری اصل منزل ہے۔

۲۔ ان افراد کا بے لاگ، منصفانہ اور شفاف احتساب جو بگاڑ کے ذمہ دار رہے ہیں۔

۳۔ نظام انتخاب میں ایسی تبدیلیاں کہ ایک مفاد پرست لیکن صاحب وسائل طبقے سے نجات پائی جا سکے، جمہور کو ان کا حق انتخاب صحیح صحیح ادا کرنے کا موقع ملے اور دستور کی دفعہ ۶۲ کے مطابق عوام کے حقیقی نمایندے برسراقتدار آ سکیں۔ یہ انتخابات ایک آزاد انتخابی کمیشن اور غیر جانب دار عبوری حکومت کے تحت منعقد ہوں۔

۴۔ پاکستان کے تمام لوگوں، تمام صوبوں اور علاقوں کے ساتھ انصاف ہونا چاہیے اور اختیارات کے مرکز میں ارتکاز کی بجائے ان کو توازن کے ساتھ مرکز، صوبوں اور مقامی انتظامی یونٹس میں تقسیم ہونا چاہیے تاکہ ہر فرد اور ہر علاقے کے لوگوں کی ضرورتیں حق و انصاف کے مطابق پوری ہو سکیں۔

۵۔ معاشی ترقی کا وہ اسلوب اختیار کیا جائے جو ملک میں خود انحصاری پیدا کرے، دولت کی تقسیم منصفانہ ہو، معاشی خوش حالی میں ملک کے تمام شہری پورے طور پر شریک ہو سکیں اور زندگی کی بنیادی سہولتیں تمام انسانوں کو عزت اور آزادی کے ساتھ حاصل ہو سکیں۔ قرضوں کی معیشت سے ایک متعین مدت کے اندر نجات حاصل کی جائے اور مالیات اور بنک کاری کے ایک ایسے نظام کا قیام عمل میں لایا جائے جو نفع و نقصان میں شرکت، امداد باہمی اور مالیاتی استحکام پر مبنی ہو۔

۶۔ تمام انسانوں کو اسلام کے دیے ہوئے بنیادی حقوق، کسی مداخلت اور رو رعایت کے بغیر، حاصل ہوں اور مظلوم اور دبے ہوئے طبقات، خصوصیت سے خواتین کو، ان کے جائز حقوق کی مکمل ضمانت ہو۔

۷۔ غیر مسلموں کے حقوق کی مکمل پاس داری کی جائے۔

۸۔ عدالت، انتظامیہ اور پولیس کو سیاسی مداخلت سے پاک کیا جائے، ایک موثر نظام احتساب قائم کیا جائے، اور تمام شہریوں کو فوری انصاف کی فراہمی کی ضمانت دی جائے۔

۹۔ ملک کی سیاسی زندگی اور انتظامیہ کو کرپشن سے مکمل طور پر پاک کیا جائے اور زندگی کے سب شعبوں میں عوام کی شرکت، اسلام کے اصول شوریٰ پر عمل، آزادیٔ صحافت کا تحفظ اور سیاسی عمل، بشمول سیاسی جماعتوں کے اندرونی نظام میں جمہوری اصولوں پر عمل درآمد، یقینی بنایا جائے۔

۱۰۔ جہاد کشمیر کی مکمل معاونت اور جموں و کشمیر کے عوام کے لیے اقوام متحدہ کی قراردادوں کے

مطابق حق خود ارادیت کا حصول کے لیے ممکنہ تدابیر اختیار کی جائیں۔

۱۱۔ پاکستان کی آزادی کا تحفظ اور مساوی بنیادوں پر تمام دوسرے ممالک سے تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی جائے لیکن پاکستان پر کسی دوسرے ملک یا ادارے کی سیاسی، نظریاتی، معاشی یا عسکری بالادستی کسی شکل میں بھی قبول نہیں کی جائے۔ ملک کے دفاع بشمول ایٹمی صلاحیت کو اتنا مضبوط کیا جائے کہ ملک و ملت کی آزادی اور خود مختاری کا مکمل تحفظ ہو سکے۔

۱۲۔ آزاد خارجہ پالیسی اختیار کی جائے جو انصاف کے اصولوں پر مبنی ہو اور جس میں امت مسلمہ کی وحدت اور ترقی کو مرکزی حیثیت حاصل ہو۔

---

آج ہم سب کو پاکستان کی بقا اور استحکام کی جدوجہد کے لیے ان اصولوں پر اتفاق اور ان کے مطابق نئے نظام کے قیام کا عہد کرنا چاہیے۔ اس عہد کو پورا کرنے کے لیے قابل اعتماد قیادت کو بروے کار لانے کی اجتماعی تحریک، وقت کی اصل ضرورت ہے۔ وقت کے اس اہم ترین تقاضے کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ جہاں اس جدوجہد کا آغاز ایک فوری ضرورت ہے وہیں یہ بات بھی سامنے رہے کہ حالات کی اصلاح کے لیے کوئی مختصر راستہ (short cut) نہیں۔ یہ جدوجہد، مسلسل محنت اور قربانیوں کا تقاضا کرتی ہے۔ ہتھیلی پر سرسوں نہ عالم جمادات میں ممکن ہے اور نہ سیاسی اور اجتماعی زندگی میں۔ رائے عامہ کو تیار کرنا اور معاشرے کے تمام صحت مند اور بااثر عناصر کو ایک پلیٹ فارم پر، ایک پروگرام پر، اور ایک متفق علیہ قیادت پر جمع کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ جہاں حالات کا بگاڑ فوری اقدام کا متقاضی ہے وہیں اجتماعی اور اصلاحی تحریکات کے نشو و ارتقا کے کچھ ابدی اصول اور ضوابط ہیں جن کا لحاظ ضروری ہے۔ توازن اور راہ وسط ہی مستقل اور دیرپا نتائج کے ضامن ہو سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں حق کی کامیابی اور معروف کی سربلندی کے لیے جہاد، صبر، استقامت اور رابطہ مسلسل کو شرط لازم قرار دیا گیا ہے۔ اخلاص فی اللہ کے ساتھ ساتھ مادی اور اخلاقی قوت کی فراہمی، جدید ٹکنالوجی کی تسخیر اور مسلسل اور صبر آزما جدوجہد ہی حالات کے دھارے کو بدلنے کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ اس راستے میں جہاں سستی اور غفلت جرم ہے وہیں عجلت بھی سم قاتل ہے۔ بات محض آرزوؤں اور تمناؤں کی نہیں بلکہ پختہ ایمان، یقین کامل کے ساتھ ساتھ جہد مسلسل اور صبر و استقامت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود متنبہ کیا ہے:

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ط مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ لا وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ○ (النساء ۴: ۱۲۳-۱۲۴) انجام کار نہ تمھاری آرزوؤں پر موقوف ہے نہ اہل کتاب

کی آرزوؤں پر۔ جو بھی برائی کرے گا اس کا پھل پائے گا اور اللہ کے مقابلے میں اپنے لیے کوئی حامی و مددگار نہ پا سکے گا۔ اور جو نیک عمل کرے گا' خواہ مرد ہو یا عورت' بشرطیکہ ہو وہ مومن' تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی۔

جدوجہد اور عمل ہی سے حالات بدل سکتے ہیں اور حق کی گواہی دی جا سکتی ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○ ( الحجرات ۴۹: ۱۵) حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے پھر انھوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں۔

وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ ( ال عمرٰن ۳ : ۱۰۱) جو اللہ کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے گا وہ ضرور راہ راست پا لے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا قف وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ ( ال عمرٰن ۳ : ۲۰۰) اے لوگو جو ایمان لائے ہو' صبر سے کام لو' باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ' حق کی خدمت کے لیے کمربستہ رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو' امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔

جس طرح قیام پاکستان کی جدوجہد میں ملت اسلامیہ پاک و ہند نے صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا اور ایثار و قربانی سے کامیابی کی راہ کو ہموار کیا اسی طرح اب پاکستان کو باہر اور اندر کے دشمنوں سے بچانے اور اسے اس کے حقیقی مقاصد کے حصول کے لیے نئی زندگی دینے کی جدوجہد بھی صبر و استقامت' خلوص و ایثار' اخوت اور وسعت قلب اور قربانی اور حکمت کی متقاضی ہے۔ مشکلات اپنی جگہ' صبر آزما جدوجہد کے تقاضے مسلّم' قوم کو بیدار اور متحرک کرنے کی جدوجہد کی صعوبتیں برحق --- لیکن پاکستان کی حفاظت' ساڑھے تیرہ کروڑ انسانوں کے مستقبل کا تحفظ' برادران جموں و کشمیر کی آزادی کا حصول اور اس ملک کی اسلام کے حیات بخش اور مبنی برانصاف اصولوں کے مطابق تعمیر نو کے لیے' سر دھڑ کی بازی لگا دینے' اور جرأت اور حکمت سے اس جدوجہد کو اپنے منطقی نتائج پر پہنچانے کی جدوجہد کے سوا قوم کے سامنے کوئی راستہ نہیں ؎

برہم ہوں بجلیاں کہ ہوائیں خلاف ہوں
کچھ بھی ہو اہتمام گلستاں کریں گے ہم

--------------------

(زیر پرنٹ دستیاب ہیں۔ منشورات' منصورہ' ملتان روڈ' لاہور)

# کلمہ طیبہ پیدا کرتا ہے:

فکر میں سلجھاؤ

طبیعت میں سلامت

مزاج میں اعتدال

سیرت میں مضبوطی

اخلاق میں پاکیزگی

روح میں لطافت

جسم میں طہارت و نظافت

برتاؤ میں خوش گواری

معاملات میں راست بازی

کلام میں صداقت شعاری

قول و قرار میں پختگی

معاشرت میں حسن سلوک

تہذیب میں فضیلت

تمدن میں توازن

معیشت میں عدل و مواساۃ

سیاست میں دیانت

جنگ میں شرافت

صلح میں خلوص

عہد و پیمان میں وثوق

وہ ایک ایسا پارس ہے جس کی تاثیر اگر کوئی ٹھیک ٹھیک قبول کر لے تو کندن بن جائے۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۴۸۴)

# دفاع پاکستان کس طرح؟

میں اس موقع پر ان لوگوں کو جو اسلامی اصولوں پر کام کرنا چاہتے ہیں' دفاع کے سلسلے میں چند مشورے دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

**اہم ترین اسلحہ --- اخلاقی طاقت**: یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ پاکستان پورے کا پورا سرحد ہے۔ کوئی بڑا شہر ایسا نہیں جو سرحد پر واقع نہ ہو۔ اس لیے یہ اشد ضروری ہے کہ ہر شخص اپنی ڈیوٹی سمجھے اور ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہے۔ ایسے موقع پر سب سے زیادہ اہمیت جس چیز کو حاصل ہوتی ہے' جسے کافر و مومن سب جانتے ہیں' وہ قوم کا مورال (morale) ہے' یعنی اس کی اخلاقی طاقت۔ اگر اخلاقی طاقت موجود نہ ہو تو دوسری جنگی طاقت بے کار ثابت ہوا کرتی ہے۔ اخلاقی طاقت کی کمی کو اسلحے کی فراوانی پورا نہیں کر سکتی بلکہ اس حالت میں ایک قوم کا اپنا فراہم کردہ اسلحہ اس کے دشمن کے کام آتا ہے۔ اخلاقی قوت کی اہمیت کا احساس اگرچہ مسلم و غیر مسلم سب کو یکساں ہے' مگر اس کے تصور' اس کے حدود اور اس کے برقرار رکھنے کی تدابیر' تینوں چیزوں میں' ہمارے اور ان کے درمیان کافی فرق ہے۔ بدقسمتی سے اس وقت ہماری قوم میں اسلامی تعلیم اور اسلامی تربیت کی کمی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ہم "اخلاقی قوت" کے غیر اسلامی تصور اور حدود اور اس کی بحالی کے غیر اسلامی طریقوں پر نہ مائل ہو جائیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس وقت انھی تینوں امور کی اسلامی نقطۂ نظر سے تشریح کر دوں۔

**اخلاقی طاقت کا غیر اسلامی تصور**: اخلاقی طاقت کا غیر اسلامی تصور یہ ہے کہ قوم کو اپنی طاقت پر پوری طرح اعتماد ہو۔ اسے اپنی قومیت سے' اپنے وطن سے اور قومی کلچر سے عشق ہو اور اس کو بچانے کے لیے وہ جان و مال کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو۔ اخلاقی طاقت کے حدود کو وہ زیادہ سے زیادہ بس حوصلے اور ہمت اور جذبۂ مدافعت تک وسیع سمجھتے ہوں اور اس کی بحالی کے لیے وہ زیادہ تر غیر اخلاقی تدابیر سے کام لیتے ہوں' مثلاً جھوٹے اعلانات' اپنی قوت کے متعلق مبالغہ آمیز بیانات' اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو چھپانا اور فتح و کامرانی کی بے بنیاد امیدوں کو ابھارنا۔ ان کے نزدیک صداقت اور واقعیت سے مورال گرتا ہے اور جھوٹ سے وہ قائم ہوتا ہے۔

**اخلاقی طاقت کا اسلامی تصور:** اس کے برعکس اخلاقی طاقت کا اسلامی تصور یہ ہے کہ قوم کا اصلی اعتماد اپنی طاقت کے بجائے اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید پر ہو۔ اسلام اپنی طاقت پر بھروسا کرنا نہیں سکھاتا بلکہ اللہ پر توکل کرنا سکھاتا ہے۔ ایک سچا مومن ذرائع تو وہ سب فراہم کرتا ہے جو ایک کافر فراہم کرتا ہے لیکن اس کی نگاہ ہمیشہ اللہ پر ہوتی ہے۔ اسی سے وہ مدد مانگتا ہے اور فتح و کامرانی کی ساری امیدیں اسی سے وابستہ کرتا ہے۔ اللہ پر یہ اعتماد اس کے حوصلوں کو اس وقت بھی قائم رکھتا ہے' جب کہ سارے ذرائع و وسائل اس کا ساتھ چھوڑ دیں کیونکہ وسائل اگر باقی نہ رہیں تب بھی اللہ باقی ہے جس پر اس کا اصلی اعتماد تھا اور وہ قادر مطلق ہے جس کے ایک اشارے سے ہرتی ہوئی بازی جیت سکتی ہے۔

اس توکل علی اللہ کی وجہ سے ہمارے ہاں "اخلاقی قوت" تک کے حدود بھی غیر اسلامی حدود سے وسیع تر ہیں۔

**توکل علی اللہ کی صحیح صورت:** ہم اخلاقی قوت کو صرف حوصلے اور ہمت اور جذبۂ دفاع تک محدود نہیں سمجھتے بلکہ اسے پورے اخلاقی کردار پر حاوی سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ جسے اللہ سے مدد حاصل کرنا ہو' اسے اپنی تمام زندگی کو اس کی مرضی کے مطابق بنانا پڑتا ہے۔ یہ سراسر ایک نامعقول بات ہے کہ ایک شخص یا قوم ایک طرف اللہ کی نافرمانی کرے اور دوسری طرف اس سے مدد بھی مانگے۔ ایسے توکل علی اللہ کی مثال تو بالکل ایسی ہے جیسے ایک شخص گھر سے چوری کے لیے نکلے اور اس کے بیوی بچے خدا سے دعا مانگیں کہ وہ چوری کا مال لے کر خیریت سے گھر لوٹ آئے۔ توکل کی یہ صورت بالکل غلط ہے۔ اللہ کے احکام کی پوری طرح پابندی کرنے کے بعد ہی اللہ پر توکل کرنا صحیح توکل ہو سکتا ہے۔

میں آپ حضرات کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جو قوم خدا کو سرے سے مانتی ہی نہ ہو وہ تو اس کی نافرمانیاں کر کے کچھ دیر پنپ بھی سکتی ہے کیونکہ اس کے لیے اللہ کا قانون امہال و استدراج دوسرا ہے۔ مگر جو قوم خدا پرستی کی مدعی' کتاب الٰہی کی حامل اور دین حق کی نمایندہ بنی ہوئی ہو' وہ اگر احکام الٰہی کے ساتھ اس طرح کے مذاق کرنے پر اتر آئے' تو اسے دنیا کی کوئی طاقت خدا کی سزا سے نہیں بچا سکتی۔ یہ حرکتیں خدا کی رحمت کو نہیں بلکہ اس کے غضب کو دعوت دینے والی ہیں۔

**اخلاقی طاقت بحال رکھنے کی تدابیر:**

**سچ' مورال کی بنیاد:** اخلاقی طاقت کو برقرار رکھنے کی تدابیر میں بھی ہمارے اور کفار کے درمیان بڑا اختلاف ہے۔ جھوٹ سے مورال کبھی بحال نہیں رکھا جا سکتا۔ حقیقت میں مورال کی بحالی کے لیے سچ سے زیادہ کوئی چیز کارگر نہیں ہوا کرتی۔ جب تک ہم اپنی کمزوریوں کا ٹھیک احساس نہ کریں گے' ہم اپنی کمزوریاں آخر دور کیسے کریں گے؟ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنی کمزوریوں کا اشتہار بھی دیا جانا ضروری ہے۔ مگر قوم کو اپنی کمزوریوں سے آگاہ ضرور ہونا چاہیے تاکہ جہاں تک بس چلے ان کو دور کرنے کی فکر کی

جائے۔ جھوٹ کے ہتھیار کی کامیابی ہمیشہ عارضی ہوتی ہے، مستقل کبھی نہیں ہوتی۔ یہ پردہ جب ہٹتا ہے تو رہا سہا وقار بھی جاتا رہتا ہے۔

**باتوں کے بجائے عمل**: مورال کی بحالی کے لیے جوشیلی تقریریں اور بڑے بڑے اعلان بھی کام نہیں آتے۔ اس قسم کی خالی خولی پُرجوش باتوں سے مورال اگر بحال بھی ہو جائے تو یہ مستقل نہیں عارضی ہوتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ باتوں کی بجائے عملاً اپنا زور بڑھائیں۔

**ظلم و ستم سے دفاع کمزور**: دفاع کے معاملے میں خاص اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ ملک کے اندر ظلم و ستم اور بے انصافیوں اور حق تلفیوں کو قطعی طور پر بند ہونا چاہیے۔ اگرچہ یہ چیزیں کسی حالت میں معاشرے کے اندر موجود نہ رہنی چاہییں، لیکن جنگ کے موقع پر جو شخص اس طرح کی کوئی حرکت کرتا ہے، وہ دراصل ہماری مدافعت کے قلعے میں شگاف ڈالتا ہے اور دشمن کو گھس آنے کا راستہ دیتا ہے۔ اس بات کو خصوصیت کے ساتھ حکومت کے افسروں اور اہل کاروں تک پہنچایئے، پولیس کے افسروں اور حاکمانِ عدالت کے ذہن نشین کیجیے اور ان سب لوگوں کو سمجھایئے جنھیں اللہ نے دوسروں پر اقتدار بخشا ہے۔ یہ ایک معمولی سمجھ بوجھ کی بات ہے کہ ایک آدمی کے دل میں اگر ملک کے بچانے کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ وہ محسوس کرتا ہو کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں اس کے حقوق محفوظ ہیں۔ اس کی عزت محفوظ ہے اور اس کے سارے جائز حقوق پورے ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر اسے زندگی کے تلخ واقعات یہ محسوس کرائیں کہ یہاں نہ اس کی عزت ہی محفوظ ہے اور نہ اس کے شخصی حقوق، تو کوئی وجہ نہیں کہ محض اس سرزمین کی خاک کے ذروں کی حفاظت کے لیے کوئی جذبہ اس کے اندر مشتعل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں عام لوگ انصاف سے محروم ہوں، معاشی ظلم نے لوگوں کو فاقہ کش بنا دیا ہو اور بالادستوں کے ہاتھوں سے زیردستوں کی عزت و آبرو بھی محفوظ نہ ہو وہاں بیرونی حملوں کے موقع پر عوام میں کوئی جذبۂ دفاع پیدا ہی نہیں ہوتا، کیونکہ ان کے پاس کوئی ایسی چیز محفوظ ہی نہیں ہوتی جو انھیں جان سے بڑھ کر عزیز ہو اور جسے بچانے کی وہ ضرورت محسوس کریں۔

تاریخ میں بارہا یہ مثالیں سامنے آ چکی ہیں کہ ایسے حالات میں تمام آبادی نے بیرونی حملوں کا پوری سرد مہری کے ساتھ سامنا کیا ہے اور بعض اوقات مظلوم آبادی نے محض جذبۂ انتقام کے تحت باہر کے حملہ آوروں کا خیر مقدم تک کیا ہے تاکہ اپنی آنکھوں سے ان لوگوں کی پامالی دیکھیں جو ان کے حقوق پامال کرتے رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ تاریخ کی ان مثالوں سے ہم سبق لیں اور ہم میں سے ہر شخص دوسروں کے حقوق اور عزت و آبرو کا پاس و لحاظ کرے اور ہمارے ملک میں کامل عدل و انصاف قائم ہو۔ ظلم سے بڑھ کر قومی دفاع کو کمزور کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ جو شخص اپنی نفسانیت کی خاطر اپنی قوم کے لوگوں کو بے غیرت اور بے حمیت بناتا ہے وہ دراصل دشمنوں کے لیے راستہ صاف کرتا ہے۔

**اسلام کے گھر کی حفاظت:** آپ یہ بات بھی لوگوں کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کریں کہ اگرچہ اپنے گھر کی حفاظت، اپنی آبرو کی حفاظت، اپنے جان و مال کی حفاظت اور اپنے ملک کی حفاظت بھی ضروری ہے، اور جو مسلمان ان چیزوں کو بچانے کے لیے لڑ کر جان دیتا ہے اسے بھی درجہ شہادت نصیب ہوتا ہے، مگر اصل بنیادی جذبہ جو ہمارے دلوں میں کارفرما ہونا چاہیے وہ خدا کے دین کی مدافعت کا جذبہ ہے۔ جتنا زیادہ یہ جذبہ ہوگا اتنا ہی زیادہ ہمارا دفاع مضبوط ہوگا اور اسی قدر زیادہ ہم اجر و ثواب کے مستحق ہوں گے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سرزمین ہمارا نہیں بلکہ اسلام کا گھر ہے۔ ہمیں یہاں صدیوں کے بعد پھر موقع ملا ہے کہ خدا کے دین کو اس کی اصلی صورت میں قائم کریں اور دنیا کے سامنے اس کی صداقت کی عملی شہادت پیش کریں۔ ہمارے لیے یہ سب سے بڑی نعمت ہے اور ہم ہر قیمت پر اس کی حفاظت کے لیے تیار ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان کے ہر مسلمان میں اس نعمت کی قدر کا جذبہ پیدا کریں اور اس کے قلب و روح میں یہ خیال جاگزیں کر دیں کہ اس نعمت کی حفاظت میں کوئی قربانی بھی گراں نہیں ہے۔ یاد رکھیے خدا اور اس کے دین کی خاطر جان دینے کا مرتبہ اپنے گھربار، اپنے مال اور آبرو کی خاطر جان دینے سے بدرجہا زیادہ بلند ہے اور اس جذبے کے تحت جو شہادت میسر ہو وہ بہت اونچے درجے کی شہادت ہے۔ (سرحد پر بھارتی افواج جمع ہونے پر خطاب، سہ روزہ کوثر لاہور، ۲۸ جولائی ۱۹۵۱، تدوین: م - س)۔

# کلام نبویؐ کی کرنیں

مولانا عبدالمالک

حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
مجلسیں تین ہیں: ایک صحیح سالم یعنی ایسی مجلس جس میں کوئی گناہ نہ کیا گیا ہو۔ دوسری وہ جس میں نیکیوں کو بطور غنیمت سمیٹا گیا ہو۔ تیسری وہ جس میں بیٹھنے والا ہلاک اور گنہ گار ہوا (مسند احمد الشیبانی، ج ۱۹، ص ۱۶۵)۔

انسان جو وقت بھی تنہائی میں نہیں گزارتا' وہ کسی نہ کسی مجلس میں گزارتا ہے۔ مجلس کے مفہوم کو وسعت دی جائے تو کسی دوسرے شخص سے گفتگو بھی درحقیقت مجلس کی ہی ایک شکل ہے۔ آج کل اگر ٹی وی کے سامنے بیٹھا جائے' ریڈیو سے یا کسی اور ذریعے سے پروگرام سنا جائے تو یہ بھی مجلس کی ہی ایک شکل ہے۔ مطالعہ کتاب میں بھی قاری مصنف کے ساتھ مجلس کرتا ہے' ہم نشین ہوتا ہے' اس کی باتیں سنتا اور سمجھتا ہے۔ اہل خانہ کے ساتھ بیٹھنا' دفتر و کاروبار میں احباب کے ساتھ وقت گزارنا' کسی اجتماع میں شرکت کرنا' چوپالوں میں بیٹھنا تو مجلس ہے ہی۔ غرض دیکھا جائے تو روز مرہ اوقات کا کافی حصہ انسان مجلسوں میں گزارتا ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت حکمت سے نشان دہی کردی کہ مجلس تین طرح کی ہو سکتی ہے۔ مجلس کی قسم پہچاننا کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ انسان کا ضمیر' اگر اسے تھپک کر سلا نہ دیا گیا ہو' تو خود ہی بتاتا ہے کہ کس مجلس سے نیکیاں مال غنیمت کی طرح ملیں گی' کس سے گناہ سمیٹے جائیں گے اور کون سی وہ ہیں جن میں گناہ نہ کیا گیا ہو۔ چاہیے کہ گناہ والی مجلس سے جو ہلاک کرنے والی ہیں بالکلیہ پرہیز کی کوشش کریں۔ بے احتیاطی ہو تو استغفار اور آیندہ احتیاط کریں۔ نیکیوں والی مجلس کے تناسب کو بڑھانے کی کوشش کریں۔

○

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
تباہ ہو دینار اور درہم اور کپڑے اور چادر کا بندہ۔ اگر اسے دیے جائیں تو راضی رہے اور نہ دیے جائیں تو ناراض ہو۔ تباہ ہو اور اوندھا ہو' اور اگر اسے کانٹا چبھے تو نہ نکالا جائے۔
خوش خبری ہے اس بندے کے لیے جو اللہ کی راہ میں گھوڑے کی باگ کو پکڑنے والا ہے' پراگندہ سر'

پاؤں غبار آلود۔ اگر اسے لشکر سے آگے رکھا جائے تو آگے رہے' پیچھے رکھا جائے تو پیچھے رہے (ظاہری حیثیت کچھ نہ ہو)۔ اگر وہ کسی سے ملنے کی اجازت مانگے تو اسے اجازت نہ دی جائے' اگر سفارش کرے تو سفارش نہ مانی جائے (بخاری کتاب الجہاد)۔

دنیا میں ان لوگوں پر رشک کیا جاتا ہے جو باحیثیت ہیں' جن کی سفارش سنی جاتی ہے' وہ جس سے ملنا چاہیں مل سکتے ہیں۔ لیکن یہاں اللہ کے رسولؐ نے خوش خبری گھوڑے کی باگ پکڑنے جیسے کام کرنے والے بے حیثیت لوگوں کو دی ہے (مبارک ہو!)۔ لیکن ان کی اصل صفت یہ ہے کہ انھیں جہاں بھی رکھا جائے' آگے یا پیچھے' خوشی سے رہیں' خود اپنا کوئی مقام نہ سمجھیں۔ اس صفت کی عظمت اور اہمیت کا احساس ان افراد کو بخوبی ہے جو کسی نظم کے تحت مجتمع ہو کر کام کریں۔ اگر قائد کو یہ اعتماد ہو کہ وہ جس کو جہاں چاہے کھڑا کر سکتا ہے' وہ ناراض ہو گا نہ اس کے دوست محسوس کریں گے تو ایسی اجتماعیت کی طاقت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ اللہ کی راہ میں کام کرنے والے لوگوں کے بالمقابل' دنیا کے بیٹے ہیں جنھیں بجا طور پر مال و دولت اور کپڑے کا بندہ کہا گیا ہے جو کھانے پہننے میں ہی مگن رہتے ہیں' اس کے لیے بھاگ دوڑ کرتے ہیں۔ جو ان کو فراہم کر دے اس سے خوش' جو نہ کرے اس سے ناخوش۔ اللہ کے رسولؐ نے ایسے شخص کو تباہی کا مژدہ سنایا ہے اور یہ بددعا دی ہے کہ اسے کانٹا بھی چبھے' تو نہ نکلے۔ اس کی پوری تکلیف اسے ملے۔ اللہ ہمیں اس سے پناہ میں رکھے اور ہماری نظروں میں آخرت کو وقیع بنائے۔

○

حضرت قبیصہؓ بن مخارق بیان کرتے ہیں:
میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔
آپؐ نے پوچھا: قبیصہؓ! کیسے آنا ہوا؟
میں نے عرض کیا: عمر زیادہ ہو گئی ہے اور ہڈیاں نرم پڑ گئی ہیں۔ میں حاضر ہوا ہوں کہ آپؐ مجھے کوئی ایسی بات سکھا دیجیے جس سے اللہ مجھے خصوصی نفع عنایت فرما دیں۔
آپؐ نے فرمایا: قبیصہؓ! تم جس پتھر' درخت اور کچی اینٹوں کے پاس سے گزرے ہو' اس نے تمھارے لیے استغفار کیا ہے۔
قبیصہؓ! جب فجر کی نماز پڑھ لو تو تین مرتبہ یوں کہو:
سبحان اللہ العظیم وبحمدہ' "اللہ کی عظیم ذات کی پاکیزگی بیان کرتا ہوں اس کی حمد کے ساتھ" تو اندھے پن' جذام اور فالج کی بیماری سے محفوظ ہو جاؤ گے۔
پھر آپؐ نے اس دعا کی تلقین کی:
اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مِمَّا عِنْدَكَ وَافِضْ عَلَیَّ مِنْ فَضْلِكَ وَانْشُرْ عَلَیَّ رَحْمَتَكَ وَاَنْزِلْ عَلَیَّ مِنْ بَرَكَاتِكَ "اے اللہ! میں تجھ سے ان نعمتوں کو مانگتا ہوں جو تیرے پاس ہیں۔ مجھ پر اپنے فضل سے عنایت

فرمانے کا فیصلہ فرما اور مجھ پر اپنی رحمت کی چادر پھیلا دے اور اپنی برکتیں مجھ پر نازل فرما (الفتح الربانی ترتیب مسند احمد، ج ۱۴، ص ۲۲۵)۔

بڑھاپے کا وقت بھی کیا ہوتا ہے۔ موت کے علاوہ اس سے بچانے والا کوئی نہیں۔ بڑھاپا اچھا بھی گزر سکتا ہے اور برا بھی۔ اس کی فکر کرنا چاہیے۔ سب سے زیادہ پریشانی تو امراض کی ہوتی ہے، قویٰ تو جواب دیتے ہی ہیں۔ زندگی کے اس مرحلے میں انسان اپنے رب کی طرف زیادہ متوجہ ہوتا ہے، دعائیں کرنے کے لیے فرصت بھی نصیب ہوتی ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے مخصوص وقت پر مختصر دعا کی تلقین کی اور شاید سائل کے دل کی بات کی کہ اس سے تم امراض سے محفوظ ہو جاؤ گے۔ آپؐ نے ان امراض کے نام لیے جو عرب میں عام تھے۔ آج ان امراض سے تحفظ حاصل ہو گا جو اب عام ہیں۔ پھر رحمت و برکت کے لیے دعا کے الفاظ سکھائے۔ اللہ تعالیٰ سے دعائیں آدمی کو بیماریوں سے بچاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بے بہا نعمتوں سے سوالی کو سکون و اطمینان ملتا ہے۔ جوان یہ دعا کریں گے تو وہ امراض سے محفوظ رہیں گے، ان کی توانائی میں اضافہ ہو گا۔

O

حضرت سہل بن معاذ جہنی اپنے والد سے بیان کرتے ہیں:
ہم نے عبداللہ بن عبدالمالک کی قیادت میں روم کے علاقے میں ایک سنان نامی قلعے کے پاس پڑاؤ ڈالا۔ لوگوں نے جگہ تنگ کر دی اور راستے میں رکاوٹ پیدا کر دی۔ اس پر معاذ نے لوگوں کے سامنے حدیث بیان کی:
لوگو! ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ میں گئے تھے۔ لوگوں نے راستہ تنگ کر دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعلان کرنے والے کو بھیجا جو یہ اعلان کرتا تھا: جس نے جگہ میں تنگی پیدا کر دی یا راستہ روک دیا، تو اس کے لیے کوئی جہاد نہیں ہے (الفتح الربانی ج ۱۴، ص ۴۴)۔

عموماً معمولی ونیاوی باتوں کا دین سے کوئی تعلق نہیں سمجھا جاتا اور دینی کام کرنے والے ان چھوٹی باتوں کو وزن دینا، دین کی شان کے خلاف تصور کرتے ہیں۔ لیکن یہاں دیکھیے کہ خود اللہ کے رسولؐ جہاد میں سرگرمی کو، اور جہاد بھی وہ جو خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں ہو رہا ہے، اس کے شرکا کو محض اس بات پر جہاد سے محرومی کی خبر دے رہے ہیں کہ ان کی ایک بالکل جائز سرگرمی سے خلق خدا کو کوئی تکلیف پہنچ رہی ہے۔ اسلام کی ترجیحات میں بندوں کو تکلیف پہنچانے یا ان کی خدمت کرنے کی جو حیثیت یا مقام ہے، اس کی دینی حیثیت عموماً نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسولؐ اللہ سے عرض کیا: "یارسول اللہ! مجھے کوئی ایسی چیز بتلا دیجیے جس سے میں خصوصی طور پر نفع اٹھاتا رہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمانوں کے راستے سے تکلیف دہ چیز کو دور کرو" (مسلم)۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک درخت مسلمانوں کے لیے تکلیف دہ تھا۔ ایک آدمی آیا اور اسے کاٹ ڈالا۔ اس کے نتیجے میں وہ جنت میں داخل ہو گیا (مسلم)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مسلم

کی تعریف ہی یہ فرمائی ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔

آج کے دور میں دین کی جدوجہد کرنے والے جو اجتماعی سرگرمیاں کرتے ہیں' ان کا عنوان جماعت ہے۔ انھیں اپنے رسولؐ کے ان فرمودات سے رہنمائی لینا چاہیے۔

○

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سامنے خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے۔ اس میں آپؐ نے خیانت کے معاملے پر خاص طور سے زور دے کر فرمایا:

دیکھو میں ایسا نہ دیکھوں کہ قیامت کے دن تم میں کوئی شخص اس طرح آئے کہ اس کی گردن پر اونٹ لدا ہوا بڑبڑا رہا ہو اور وہ شخص مجھے آواز دے: یارسولؐ اللہ! میری مدد فرمایئے' تو میں اس کے جواب میں کہہ دوں آج بھلا میں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ میں تو تجھ سے دنیا ہی میں سب کچھ صاف صاف کہہ چکا تھا۔

دیکھو ایسا نہ ہو کہ تم میں کوئی شخص اس طرح آئے کہ اس کی گدی پر گھوڑا لدا ہوا ہو اور وہ ہنہنا رہا ہو اور وہ شخص پکار رہا ہو: یارسولؐ اللہ! میری مدد فرمایئے' تو میں اس سے کہہ دوں آج بھلا میں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ میں تو تجھے دنیا ہی میں سب کچھ صاف صاف کہہ چکا تھا۔

دیکھو ایسا نہ ہو کہ تم میں کوئی قیامت کے دن اس طرح آئے کہ اس کی گردن پر بکری لدی ہوئی ہو اور وہ بول رہی ہو اور وہ شخص پکار رہا ہو: یا رسولؐ اللہ! میری مدد فرمایئے' تو میں کہہ دوں آج بھلا میں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ میں تو تجھ سے دنیا ہی میں سب کچھ صاف صاف کہہ چکا تھا۔

دیکھو ایسا نہ ہو کہ تم میں کوئی شخص قیامت کے دن آئے اور اس پر کوئی انسان بیٹھا چیخ رہا ہو اور یہ شخص پکار رہا ہو: یارسولؐ اللہ! میری مدد فرمایئے' تو میں کہہ دوں آج بھلا میں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ میں تو تجھے دنیا ہی میں سب کچھ صاف صاف کہہ چکا تھا۔

دیکھو ایسا نہ ہو کہ تم میں ایک شخص قیامت کے دن آئے اور اس کی گردن پر کپڑا لدا ہوا' ہوا میں اڑ رہا ہو اور یہ شخص پکارے: یارسولؐ اللہ! میری مدد فرمایئے' تو میں کہہ دوں بھلا آج میں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ میں تو تجھ سے دنیا ہی میں سب کچھ صاف صاف کہہ چکا تھا۔

دیکھو ایسا نہ ہو کہ تم میں ایک شخص قیامت کے دن آئے اور اس کے اوپر سونا چاندی لدا ہو اور وہ پکار رہا ہو: یارسولؐ اللہ! میری مدد فرمایئے' تو میں کہہ دوں میں آج بھلا تیری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ میں تو دنیا ہی میں تجھ سے سب کچھ صاف صاف کہہ چکا تھا (ترجمان السنہ' ج ۲' ص ۳۳۱-۳۳۲)۔

ہم سے سب کچھ صاف صاف کہا جا چکا ہے۔ پھر ہم کس آسرے پر گناہ کرتے ہیں۔

---

# تحریک اسلامی اور خواتین کا کردار

ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی ○

ترجمان القرآن میں امت مسلمہ کے احیا اور اس عظیم جدوجہد میں تحریک اسلامی کے کردار کے مختلف پہلوؤں پر بحث و گفتگو کا سلسلہ اول روز سے جاری ہے۔ غور و فکر اور تفہیم اور احتساب کا یہ عمل قوموں اور تحریکوں کی زندگی اور ترقی کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنی جسم انسانی کے لیے غذا۔ یہ کام جتنا ضروری ہے اتنا ہی نازک بھی ہے۔ ایک طرف قرآن و سنت کی ابدی ہدایات کا مکمل پاس اور امت کی تابناک تاریخی روایات کا احترام اس عمل کی اساس ہے' تو دوسری طرف بدلتے ہوئے حالات اور وقت کے چیلنجوں کا شعور اور ان کے تقاضوں کے ادراک پر اس عمل کی کامیابی اور بار آوری کا انحصار ہے۔ امت کے علما' صلحا اور مصلح (reformers) اس عظیم کام کو ہر دور میں انجام دیتے رہے ہیں اور کامیاب وہی رہے جنھوں نے امت وسط کے مزاج کے مطابق توازن اور اعتدال سے اس خدمت کو انجام دیا۔ قدامت اور جدت دونوں کے حقیقی تقاضوں کو' اپنی اصل پر سمجھوتہ کیے بغیر' پورا کرنے کی کوشش کی اور اسلامی دعوت و تحریک کو اس دریا کی مانند رواں دواں رکھا جس میں ہر لحظہ پانی کی نئی ردئیں شامل ہو کر تازگی اور فراوانی کا اہتمام کرتی ہیں۔ دریا نئے راستے بھی نکالتا ہے لیکن اس کی حیثیت اور کردار میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ تحریکوں میں یہ تازگی غور و فکر' بحث و گفتگو' اجتہاد و اجماع' نئے تجربات اور تاریخ سے سبق سیکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔

بیسویں صدی کی اسلامی تحریکات نے بھی اسی راستے کو اختیار کر کے' روایت سے بغاوت کیے بغیر' جمود کی برف کو توڑا اور امت کے احیا کا موجودہ آہنگ قائم کیا۔ یہ کام محض ایک یک وقتی عمل (one shot operation) نہیں بلکہ ایک مسلسل اور پیہم عمل (on going process) ہے اور اس سے دریا دریا رہے گا' جو ہر بن کر دم نہیں توڑ دے گا۔

---

○ مدیر' ماہنامہ زندگی نو' دہلی' بھارت

غور و فکر' نقد و تبصرہ' احتساب اور خود احتسابی کی اس روایت کو جاری رکھتے ہوئے ہم ترجمان القرآن میں ایسی چیزیں شائع کرنے کا اہتمام کر رہے ہیں جو ہوا کے نئے جھونکوں کا کام کر سکتی ہیں۔ زندگی نو' دہلی کے مدیر اور ہمارے محترم تحریکی ساتھی اور مفکر ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی نے تحریک اسلامی میں عورتوں کے کردار پر قلم اٹھایا جسے ہم قارئین ترجمان القرآن کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ (مدیر)

مسلم معاشرے کی اصلاح اور تحریک اسلامی کی دعوت کا ایک اہم چیلنج خواتین کے عمومی کردار سے متعلق ہے۔ مغربی یورش کا ایک اہم ہدف اسلامی نظام زندگی میں عورت کے حقوق اور اس کا سماجی کردار ہے۔ اس محاذ پر غفلت اور غیر دانش مندانہ حکمت عملی کے بہت دور رس اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

خواتین کے مسئلے میں علما اور تحریک اسلامی کو دفاع اور تحفظ کے بجاے اسلامی نقطۂ نظر کو پوری قوت سے پیش کرنا چاہیے اور اقدامی انداز اختیار کرنا چاہیے۔ ایسا اثبات جس سے ایک طرف اسلامی نظام فکر کی خیر و برکات اور اس کا توازن اور عدل واضح ہوتے جائیں اور دوسری طرف عصری نقطۂ نظر کی بنیادیں منہدم ہوتی چلی جائیں اور اس کی اساس پر تشکیل پانے والے سماج کی خیرہ کن تاب ناکی کے پس پردہ' تاریکیوں کی جھلک بھی دکھائی دیتی رہے۔ اس کام کے لیے ان تھک جدوجہد لازم ہے' علمی اور تحقیقی مساعی درکار ہیں' تجزیاتی علم اور اعداد و شمار پر غیر معمولی گرفت کا حصول مطلوب ہے' اس کے لیے نہ محض روایتی علم کافی ہے اور نہ ہی اعداد و شمار کا سطحی علم۔ اثبات سے مراد اقدام ہے۔ دفاعی تحفظ دور حاضر کی حیرت زا ٹکنالوجی کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ بالخصوص انفارمیشن ٹکنالوجی جس نے انٹرنیٹ' ای میل اور دوسرے مماثل ذرائع سے ملکی سرحدیں بالفعل ختم کر دی ہیں۔ اب ہر طرح کی خرافات انفارمیشن کے نام سے پوری دنیا میں موجود ہیں' اباحیت' پورنوگرافی' سب کچھ بٹن دبانے سے حاصل ہے۔ اس کو کوئی ملک روک نہیں سکتا۔ اس یورش کا مقابلہ صرف زیادہ طاقت ور اور پرکشش جوابی یورش سے ہی ممکن ہے۔ اسی لیے اقدام درکار ہے' جوابی سیلاب کی ضرورت ہے۔

اس اثبات کا محور' اسلامی نظام فکر و عمل اور اس کے اصول اور اقدار ہوں گے۔ ان کی واضح اور جرات مندانہ تفسیر اور تعبیر کی ضرورت ہے۔ یہ اثبات' اس تاریخی ثقافت اور ان تمام اداروں کا اثبات ہرگز نہ ہونا چاہیے جسے ملت اسلامیہ نے اپنے طویل سفر میں اپنی اجتماعی زندگی کا لازمی جز بنا لیا ہے۔ قرآن کریم کی ابدی تعلیمات اور رسولؐ اللہ کی سنت' اس جدوجہد کی حدود اور اس کا رخ متعین کریں گے۔ ہمارے رجحانات اور ہماری مرضیات' ہمارے رسم و رواج اور ہماری کلچرل اقدار' ان سب سے نکھار کر ان کا اثبات اور توضیح وقت کا بھی تقاضا ہیں اور ہماری دینی ذمہ داری بھی۔

قرآن و سنت نے خواتین کے متعلق جو بیش بہا متوازن اور عادلانہ تعلیمات عطا کی ہیں ان کا از سرنو اثبات خود مسلم سماج کے لیے بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ دعوت الی غیر المسلمین کے لیے۔ یہ ایک

انقلابی جدوجہد ہوگی جسے انجام دیے بغیر ہم اس سماج کا تزکیہ اور اس کی اصلاح نہیں کر سکتے اور نہ ہی صحیح اسلامی نہج پر اس کی تعمیر ممکن ہے۔

اس ضمن میں چند باتیں بطور تمہید کے گزارش کرنا ناگزیر سمجھتا ہوں۔

پہلی بات یہ ہے کہ مسلم سماج اس وقت دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک وہ ہے جو مغربی کلچر اور تعلیم اور اس کے ضمن میں آنے والی معاشی ترقی سے اتنا متاثر ہے کہ اس نے اسلامی قدروں کو قطعاً نظرانداز کر دیا ہے۔ اس طبقے کی یہ بھی کوشش ہے کہ پورے مسلم سماج کو بدل ڈالے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو عاقبت اسی میں سمجھتا ہے کہ وہ روایتی زندگی سے پوری قوت سے چمٹا رہے تاکہ اس کا دین و مذہب سلامت رہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ جدید تہذیب کے تقاضوں اور مادی ترقی کی یورش کے سامنے ہمارے قدیم ادارے اور رسم و رواج ایک ایک کر کے سپر ڈالتے جا رہے ہیں۔ جدید زندگی کے تقاضوں کے تحت ان کو برقرار رکھنا بھی مشکل نظر آتا ہے۔ تحریک اسلامی کو اس صورت میں رہنمائی کا کردار ادا کرنا چاہیے تاکہ قرآن و سنت کی اساسی قدروں کا احیا بھی ہو سکے اور صحت مند اور جائز عصری رجحانات کا لحاظ بھی کیا جا سکے۔ اس جدوجہد کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے مندرجہ ذیل اہم اقدام کرنے ہوں گے۔

سب سے پہلے ہم کو مدینہ منورہ کے اس معاشرے کا بنظر غائر مطالعہ کرنا ہوگا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اقدس اور اس کے بعد خلافت راشدہ کے زمانے میں قائم تھا۔ اس معاشرے میں خواتین کا کیا کردار تھا، ان کے حقوق کی پاس داری میں کن امور کو پیش نظر رکھا جاتا تھا، وہ خاندان اور عمومی سماجی زندگی میں کتنا اثر رکھتی تھیں؟ کیا خواتین کا دائرہ کار صرف اندرون خانہ تک محدود تھا یا وہ اجتماعی زندگی میں کوئی خاص کردار نبھاتی تھیں؟ کیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خواتین سے بھی اجتماعی امور میں کبھی مشورہ لیتے تھے؟ کیا آپؐ نے کوئی اجتماعی ذمہ داری کسی خاتون کے سپرد کی تھی؟ کیا اہم مواقع پر آپؐ نے صرف مردوں سے بیعت لی تھی یا خواتین کو بھی اس لائق سمجھا تھا کہ ان سے الگ بیعت لیں؟ کیا آپؐ نے دینی تعلیم اور تربیت کے لیے صرف مردوں کو وسیلہ بنایا تھا یا خواتین کو بھی براہ راست مخاطب کیا تھا؟ کیا اس پاکیزہ سماج میں خواتین اور مردوں کی دنیا ایک دوسرے سے بالکل الگ تھی؟ کیا خواتین اور مردوں کے درمیان زندگی کے اجتماعی معاملات میں قطعاً کوئی تعامل [و تعاون] نہ تھا؟ معاشی زندگی میں کیا عملاً خواتین کو تجارت اور کسب معاش میں براہ راست حصہ لینے کی یکسر ممانعت تھی؟

خوش قسمتی سے ان سوالات کا جواب حاصل کرنے کے لیے غیر مصدقہ تاریخی ذرائع کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی بلکہ احادیث کا بیش قیمت ذخیرہ موجود ہے، جس سے آپ ان میں سے اکثر سوالات کا جواب حاصل کر سکتے ہیں۔ جہاں تک خلفائے راشدین کے دور کا تعلق ہے، ان کے متعلق بھی وقیع اور مصدقہ تاریخی ذرائع موجود ہیں۔ اس دور کی خوبی یہ ہے کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے

قریب ترین تھا' اس کا پرتو تھا اور قرآن و سنت کا عکاس تھا۔ اس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ خارجی اثرات اور بیرونی کلچر سے یکسر محفوظ تھا۔ قدیم جاہلیت کے جن اجزا کو اس نے برقرار رکھا تھا وہ خود حضورؐ کے اصلاح کردہ تھے۔ اس لیے ان میں کسی غیر اسلامی آلودگی کا شائبہ بھی نہ تھا۔

اس وقت اس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ لیکن اس گہرے مطالعے سے چند باتیں قطعی طور پر ثابت ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ خواتین کے معاملے میں ایک فراخ دل اور کشادہ ظرف معاشرہ تھا۔ جس نے عورت کے وقار کو مستحکم بنیادوں پر قائم کیا تھا۔ اس کو اسی فطرت اللہ کا حامل قرار دیا تھا جس کا حامل مرد تھا۔ بحیثیت ماں اس کے قدموں کے نیچے جنت کی بشارت دی تھی اور بحیثیت بیوی اس کے واضح حقوق متعین کیے تھے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کو نیکی اور تقویٰ کا جزو لازم بتایا تھا۔ اس معاشرے میں عورت اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں شریک کار تھی جس طرح مرد۔ اقامت دین کی اس بے مثال جدوجہد میں جس کے قائد خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تھے وہ دامے درمے' قدمے سخنے شریک اور مددگار تھی۔ جوانوں نے اگر نذرانہ جان پیش کیا تھا تو ماؤں نے اپنے لاڈلوں کو بخوشی خدا اور اس کے رسولؐ کے سپرد کیا تھا۔ پھر کتنی ہی ایسی جیالی خواتین تھیں جنھوں نے بنفس نفیس غزوات میں حصہ لیا تھا۔ دوسری بات یہ کھل کر سامنے آتی ہے کہ اگرچہ وہ مخلوط سماج نہ تھا لیکن مختلف سطحوں اور میدانوں میں مردوں اور خواتین کے درمیان صحت مندانہ اور پاکیزہ تعامل تھا۔ اجتماعی امور کے حل کرنے میں' دینی تعلیم اور تربیت میں' حصول علم میں اور معاشی زندگی میں عورت اور مرد ایک دوسرے کے شریک کار تھے۔ خاندانی زندگی قرآنی تعلیمات کے مطابق باہمی محبت اور خیر سگالی پر استوار تھی۔ حسن سلوک اور حقوق و فرائض کا حسین امتزاج تھا۔ عورت کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ مرد سے اپنے حقوق کے لیے براہ راست سرور عالمؐ تک مرافعہ کرے یہاں تک کہ حق زوجیت کے لیے شوہر کی نفلی عبادت میں غیر معمولی غلو کی شکایت کرے اور اپنے حق میں فیصلے کی درخواست کرے۔ چونکہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ یہ دعویٰ تشنہ ثبوت نہ رہ جائے اس لیے چند مثالیں پیش کر رہا ہوں۔

دعوت اسلامی کے ابتدائی زمانے میں خواتین نے مردوں کے دوش بدوش جس طرح قربانیاں پیش کی ہیں اس کی مثال حضرت سمیہؓ تھیں جو اسلام کی راہ میں پہلی شہید تھیں۔ حضرت عروہؓ بنت عبدالمطلب رسولؐ اللہ کی امداد کرتی تھیں اور حضرت ام شریکؓ قریش کے اعلیٰ خاندان کی خواتین تک اسلام کی دعوت پہنچاتی تھیں اور انھیں حلقہ بگوش اسلام کرتی تھیں (الاصابہ)۔

بخاری میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ عیدالفطر کی نماز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو خطاب کیا اور اس کے بعد ان کے درمیان سے گزر کر خواتین کے پاس گئے اور ان کے سامنے سورۃ الممتحنہ کی یہ آیت پڑھی: يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ ... الی آخر الآیۃ (الممتحنہ

۶۰: ۱۲)---- اور ان سے سوال کیا کہ کیا تم سب اس پر یقین رکھتی ہو تو ایک خاتون نے جواب دیا کہ ہاں۔ اس کے بعد آپؐ نے انفاق پر ابھارا۔

بخاری اور مسلم دونوں کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے دوران خواتین نماز باجماعت کے لیے مسجد نبویؐ میں حاضر ہوتی تھیں۔

جنگی خدمات اور براہ راست جنگ میں (بوقت ضرورت) حصہ لینے کے سلسلے میں خواتین نے مردوں کے دوش بدوش حصہ لیا ہے۔ خود حضرت عائشہؓ نے جنگ احد کے موقع پر زخمی مجاہدوں کو پانی پلانے کی خدمت انجام دی ہے۔ حضرت ام عمارہؓ بنت کعبؓ نے کئی جنگوں میں حصہ لیا۔ غزوۂ احد اور غزوۂ حنین میں بہادری کے جوہر دکھائے اور کئی مشرکین کو قتل کیا (المغازی ج ۲، ص ۳۵۷)۔ مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ یمامہ میں حصہ لیا۔ اس میں حصہ لینے کے لیے آپ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے اجازت لی تھی (البدایہ والنہایہ ج ۶، ص ۳۲۳، اور المسیرہ الحلبہ ج ۲، ص ۵۰۹)۔ حضرت اسما بنت یزیدؓ جلیل القدر صحابیہ نے جنگ یرموک میں بہادری کے جوہر دکھائے اور دوسری مسلمان عورتوں کے ساتھ بہت سے رومیوں کو قتل کیا (البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۱۳۔ تاریخ طبری ج ۲، ص ۳۳۵)۔ غزوۂ احد اور غزوۂ خندق میں بھی شریک تھیں (العقد الفرید ج ۳، ص ۲۲۳۔ المغازی ج ۱، ص ۳۱۵)۔ آپ کے علاوہ حمنہؓ بنت جحش، ام سنانؓ الاسلمیہ، الیلتہؓ الغفاریہ (غزوہ احد، الاصابہ، الاصابہ)، صفیہؓ بنت عبدالمطلب (غزوۂ خندق، الاصابہ)، ام حارانؓ بنت ملحان اور کتنی ایسی خواتین تھیں جنھوں نے جنگی خدمات انجام دیں۔ اگرچہ قتال میں حصہ لینا عورتوں کے فرائض میں داخل نہیں ہے لیکن وہ بخوشی اس طرح کی خدمات اعزازی طور پر کر سکتی ہیں۔ اس امر میں کوئی ممانعت نہیں۔ لیکن مسئلہ زیر بحث جواز کا نہیں ہے بلکہ اس امر کی نشان دہی کرنا ہے کہ مدینہ منورہ کے معاشرے میں خواتین جنگی محاذ پر، اپنی پیٹھ پر مشک بھر کر لاتی تھیں اور مجاہدوں کو پانی پلاتی تھیں، زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں اور بوقت ضرورت ہتھیار کا استعمال کر کے دشمنوں کا مقابلہ بھی کرتی تھیں۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اجتماعی امور سے وہ عملاً متعلق تھیں۔ لیکن اس تعلق پر اسلامی تعلیمات کے مطابق بعض پابندیاں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام نے مرد اور عورت کے کچھ مخصوص دائرہ کار مقرر کیے ہیں جن کا لحاظ ایک شائستہ اور پاکیزہ سماج کے لیے ضروری ہے۔

مدینہ منورہ کے اس معاشرے میں خواتین سے اجتماعی معاملات میں مشورہ کرنے کی ایک اہم مثال مسئلہ خلافت حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا ہے، جس کے سلسلے میں مردوں سے مشورہ کرتے اور ان کی رائے لینے کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے خواتین کی رائے بھی لی (البدایہ والنہایہ)۔ خواتین کے تجارت اور زراعت میں حصہ لینے کی متعدد مثالیں اس معاشرے میں ملتی ہیں۔ اگرچہ شریعت نے خاندان کی کفالت مرد کا فریضہ قرار دیا ہے لیکن خواتین بشرط ضرورت مدینہ منورہ میں اپنے خاندان کی

عسرت اور تنگی کو دور کرنے کے لیے جدوجہد کرتی تھیں اور اس سلسلے میں کوئی ممانعت نہیں تھی۔ مثلاً اسماءؓ بنت ابوبکر اپنے شوہر الزبیر کی معاش حاصل کرنے میں مدد کرتی تھیں (البخاری)۔ حضرت عمرؓ بن الخطاب نے بازار کی نگہداشت کی ذمے داری شفا بنت عبداللہ بن عبدالشمس پر ڈالی تھی۔

جہاں تک ازدواجی معاملات کا تعلق ہے اس سماج میں خواتین کو اسی طرح نکاح کی تجویز پیش کرنے کی آزادی حاصل تھی جس طرح مردوں کو۔ چنانچہ حدیث کی کتابوں میں ایسے واقعات ملتے ہیں۔ مثلاً عورتوں نے زبانی یا تحریری طور پر تجویز نکاح پیش کی۔ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر خلع کی درخواست کی۔ شریعت کے عمومی احکام کے مطابق عورت کو فسخ حاصل کرنے کے لیے قاضی کے پاس مرافعہ کرنا ہوتا ہے' لیکن اس کی وجوہ کا علانیہ بیان کرنا نہ ضروری ہے اور نہ فیصلہ کن۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علیحدگی کے فیصلے محض عورت کے اصرار پر کیے ہیں۔ علم و تفقہ میں بھی خواتین مردوں سے کم نہ تھیں' بلکہ بعض محترم خواتین تو مردوں سے بھی آگے تھیں۔ مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو اپنے علم حدیث اور تفقہ کے اعتبار سے مرجع خلائق تھیں۔ ام المومنین حضرت حفصہؓ بنت عمر اپنے علم اور تفقہ کے اعتبار سے قابل اعتماد سمجھی جاتی تھیں۔ ان کی بیشتر آرا نہایت گہری بصیرت کی حامل تھیں (حیات الصحابہ ج ۱' ص ۴۷۶)۔ یہ صرف دو مثالیں ہیں جن کے مطابق خواتین مدینہ کے معاشرے میں مردوں کے نزدیک بھی مرجع تھیں۔

اس معاشرے کی امتیازی شان' قرآن و سنت کی قدروں' اصولوں اور احکام کا اتباع تھا۔ وہ معاشرہ قرآن کی اس اساسی حقیقت کا حامل تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت دونوں کو ایک دوسرے کے لیے باعث طمانیت اور وسیلہ محبت اور مودت بنایا ہے۔ وہ ایک دوسرے کا لباس ہیں جو ایک دوسرے کی ستر پوشی بھی کرتے ہیں اور محرم راز بھی بنتے ہیں' جن کو اللہ تعالیٰ نے آپس میں مددگار' حامی اور ناصر بنایا ہے۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبہ ۹:۷۱)---- مرد اور عورت دونوں اللہ کے بندے ہیں اور دونوں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے عکاس ہیں۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (الروم ۳۰:۳۰) قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔

اس کے بعد اسلام جزیرۃ العرب سے نکل کر نہایت تیزی سے دوسرے ملکوں میں پھیلا۔ لوگ جوق در جوق مسلمان ہوتے گئے۔ مگر اس وسعت کے ساتھ ساتھ ضروری تعلیم اور تربیت کا کماحقہ اہتمام نہ کیا جا سکا۔ اسلام ایسے ملکوں اور ان سوسائٹیوں میں بھی غالب آگیا جہاں اس کی آمد سے قبل دوسری تہذیبیں کارفرما تھیں' مثلاً بازنطینی تہذیب' ہندستانی تہذیب' ایرانی تہذیب وغیرہ۔ اس کے ماننے والے مسلمان ہوتے گئے مگر اپنی زندگیوں میں انھوں نے ماضی کی تہذیب کے رسم و رواج میں سے بھی اکثر کو اپنے اندر

سمو لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ' مدت زمانی کی وجہ سے وہ قرآن و سنت کے اصلی اور شفاف چشمے سے اتنے قریب نہ رہ سکے جتنا کہ مدینہ منورہ کی سوسائٹی تھی۔ اس تہذیبی اختلاط کی وجہ سے خرابیاں پیدا ہوئیں۔ ان کے رد عمل کے طور پر دینی حلقوں میں تحفظ کا احساس غالب ہونے لگا کہ جو کچھ موجود ہے اس کو بچا لیا جائے۔ اس اختلاط میں جہاں رسم و رواج متاثر ہوئے' وہاں ادب' فلسفہ اور عملی زندگی بھی اس کی زد میں آگئے۔ ازدواجی رسوم و رواج پر بھی اس کا پرتو پڑا اور خواتین کے متعلق سماج کا نقطہ نظر بھی بدل گیا۔ اس اختلاط کے اثرات کو وسعت دینے والے ذرائع میں سے ایک ذریعہ اس دور کا ادب' بالخصوص کہانیوں اور داستانوں کا ہر دلعزیز ذخیرہ تھا۔ الف لیلہ جیسی داستانوں نے عورت کو شاطر' بے وفا اور شہوانی جذبات کا استحصال کرنے والی صنف کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس تصویر کے رد عمل کے طور پر اس رجحان کو تقویت ملی کہ عورت کو قابو میں رکھنا چاہیے۔ اگر اسے آزادی دی جائے گی تو وہ بے وفائی کرے گی' مکاری سے کام لے گی اور شہوانی جذبات کا آسانی سے شکار ہو جائے گی۔ اس داستان کی ہر دل عزیزی نے شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآن و سنت کی عطا کردہ نظر پر پردہ ڈال دیا۔ باز۔۔۔نی تہذیب نے مسلمانوں کو اس حد تک متاثر کیا کہ حجاب کی ایک متعین شکل ہمارے معاشرے کا جزو لاینفک بن گئی۔ ہندو تہذیب سے واسطہ پڑا تو اس نے عورت کا مقام اور نیچے گرا دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ خط۔۔۔ کے ہمہ گیر احساس نے تحفظ اور دفاع کو ہمارے طرز عمل کی شناخت بنا دیا۔

اس کے ثبوت میں ہماری معاشرتی زندگی کے وہ رسم و رواج ہیں جو ہم نے مقامی کلچر اور غیر اسلامی طرز فکر کے نتیجے میں اختیار کر لیے تھے۔ نکاح جیسی آسان تدبیر کو جہیز اور دوسری رسومات میں ملوث کر کے مسلم معاشرے میں نہایت مشکل بنا دیا گیا۔ طلاق کو انتہائی مذموم چیز بنا دیا گیا اور مطلقہ کو اسی طرح اچھوت قرار دیا جانے لگا جس طرح ہندو سماج میں ہے۔ ہندستانی مسلم سماج میں بھی لڑکی کو بوجھ سمجھا جانے لگا اور اس کی پیدائش کو زحمت قرار دیا جانے لگا۔ وراثت میں خواتین کا حق چھیننے کے لیے اکثر زمین داروں اور تعلقہ داروں نے اودھ میں برطانیہ کے قوانین وراثت کو اختیار کر لیا جن کی رو سے صرف مرد اولاد اکبر جایداد کی مستحق ہوتی تھی۔ تجویز نکاح کے حق سے محروم کر کے اسے خواتین کے لیے باعث شرم قرار دے دیا گیا۔ یہاں تک کہ ایجاب و قبول کے وقت لڑکی کی خاموشی کو رضامندی قرار دیا جانے لگا۔ اس کو یہ بات بتائی گئی کہ پاکیزہ اور عفت مآب لڑکیاں زبان سے رضامندی کا اظہار نہیں کر سکتیں۔ شوہر کو غیر مسلم تصور کے مطابق مجازی خدا بنا دیا گیا۔ مسلمان سماج میں ایسے رواج بھی تسلیم کیے جانے لگے کہ گھر کی خواتین اپنے ہی گھر کے مردوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا نہیں کھا سکتیں۔ جس دین نے تعلیم کو دین و ایمان کی اساس قرار دیا تھا اس دین میں ایک عرصے تک خواتین کی تعلیم کو معیوب قرار دے دیا گیا تھا۔

ایک طرف یہ سماجی خرابیاں پیدا ہوئیں' دوسری طرف دین دار حلقوں نے ان کے خلاف بند باندھنے

کے لیے اسلامی قوانین کی ایسی تعبیریں کرنا اپنا طرز عمل قرار دیا جن سے صنف نازک کا تحفظ کیا جاسکے۔ اسے غیر اسلامی کلچر کی خرابیوں سے بچایا جاسکے۔ گویا یہ اس امر کا اعتراف تھا کہ برائیوں اور شیطانی وساوس سے تحفظ کی ضرورت صرف خواتین کو ہے۔ بعض نے حقوق خواتین کی ایسی تفسیر کی کہ ان کے حصول کا انحصار شوہر کی مرضی پر ہو۔ خاندان کا انتظام ہو یا بچوں کی تعلیم و تربیت' یہ صرف مردوں کا حق اور ان کی ذمہ داری قرار دی گئی تاکہ خواتین بچوں کی تربیت' شوہر کے حکم اور مرضی کے مطابق کریں۔ انھیں اختیارات حاصل نہیں ہیں بلکہ وہ صرف خدمت گار ہیں۔ قرآن حکیم اور سنت نے خواتین کو اپنے مال و دولت اور اپنی جایداد کا مالک بنایا تھا اور سنت صحیحہ ثابتہ کے نزدیک خواتین ان کا انتظام بھی کر سکتی ہیں۔ لیکن اس حق پر ہمارے رسم و رواج نے ایسی پابندیاں عائد کر دیں کہ وہ شوہروں کی مدد کے بغیر ان کا انتظام نہیں کر سکتیں۔ اپنی تجارت کرنا تو دور رہا' مردوں سے دنیوی معاملات میں تعامل ہر حیثیت سے معیوب قرار دیا گیا۔ یہاں تک کہ عورت کی آواز کو بھی محرم قرار دیا گیا۔ اجتماعی امور میں خواتین کو دخل دینے سے یکسر محروم قرار دیا گیا کہ وہ ناقص العقل ہے۔ اس مقصد کے لیے حدیث نبویؐ کی حسب منشا تاویل کی گئی۔ اس کی فطرت کی کجی ثابت کرنے کے لیے رسول اکرمؐ کے اس ارشاد کو کہ عورت ریڑھ کی ہڈی سے پیدا کی گئی ہے' ایسی تفسیر رائج کی گئی جس میں غیر اسلامی کلچر کے تصور عورت کا انعکاس تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ علماے امت نے ہر دور میں خواتین کے حقوق اور ازدواجی تعلقات کے متعلق صحیح اسلامی بنیادوں کی تعلیم اور تشریح کے ذریعے اصلاح کی جدوجہد جاری رکھی۔ مگر ان پر بھی تحفظ کا داعیہ غالب ہو گیا۔ خطرے کے مبالغہ آمیز احساس کی وجہ سے' اس امر کا اہتمام نہ کیا جاسکا کہ حقیقی اسلامی اقدار اور کلچر کو حشو و زوائد سے ممیز کیا جاتا رہے بلکہ دین دار حلقوں کی ہمت افزائی کی گئی کہ جو کچھ بھی سرمایہ موجود ہے اس کو برقرار رکھا جائے اور انحطاط سے بچایا جائے۔ تحفظ کی اس جدوجہد میں اسلامی تعلیمات اور مسلم کلچر کی تفریق کا لحاظ نہ کیا جاسکا۔

اوپر کی بحث میں ہم نے یہ عرض کیا ہے کہ اثبات اور اقدام کی اس جدوجہد کے لیے سب سے پہلے مدینہ منورہ کی سماجی زندگی کا از سرنو مطالعہ کرنا چاہیے اور اس کے عناصر ترکیبی کو نکھار کر پیش کرنا چاہیے۔ ہم نے یہ بھی عرض کیا ہے کہ مدینہ منورہ کی معاشرتی تاریخ کے لیے کتب حدیث اور مصدقہ تاریخوں میں وافر ذخیرہ موجود ہے۔ دوسری طرف امت مسلمہ کی طویل تاریخ کا بھی گہرا مطالعہ درکار ہے تاکہ تہذیبی اختلاط اور مدینہ منورہ کی پاکیزہ سوسائٹی سے زمانی بعد کی وجہ سے جو غیر اسلامی رجحانات اور رسم و رواج' مسلم سماج میں داخل ہو گئے ہیں اور جن میں سے اکثر کو مذہبی تصدیق حاصل ہو گئی انھیں ممیز کیا جاسکے۔

خواتین کے متعلق اسلامی تعلیمات اور قدروں کو از سرنو اجاگر کر کے ان کی حقیقی برکتوں کو نمایاں کرنا چاہیے۔ یہ وہ مقصد ہے جس کا حصول ہمیشہ سے علما اور مجددین امت کے پیش نظر رہا ہے' یہ انقلابی قدم

ہے۔ یہ تہذیبی قدامتوں پر اصرار نہیں ہو گا بلکہ مسلمانوں کو بالخصوص، اور عام انسانیت کو بالعموم، اس خیر کامل کی طرف دعوت کے مترادف ہے جو قرآن و سنت میں مضمر ہے اور جس کو اختیار کیے بغیر خواتین کو نہ حقوق مل سکتے ہیں اور نہ متوازن اور عدل پر مبنی معاشرہ قائم ہو سکتا ہے۔

تحریک اسلامی کو اس میدان میں قائدانہ کردار ادا کرنا چاہیے۔ اس کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے کہ تہذیب مغرب کی یورش سے آپ اپنے خاندان اور خواتین کو بچا سکیں۔ ادارے اور نقطہ ہائے نظر تو ایک ایک کر کے ٹوٹ رہے ہیں مگر اس سیلاب میں وہ اقدار بھی بہہ رہی ہیں جو قرآن و سنت نے عطا کی ہیں۔ خواتین کا تاثر یہ ہے کہ مذہب اور تحریک اسلامی، دونوں خواتین کو فروتر سمجھتے ہیں اور ان پر بندشیں عائد کرتے ہیں۔ ان کے جائز حقوق سے بے نیاز ہیں۔ اس لیے وہ عصری تہذیب کو لبیک کہہ رہی ہیں اور تحریک اسلامی کے متعلق گوناگوں اندیشوں میں مبتلا ہیں۔ ہمیں پوری جرأت اور ایمان و یقین کے ساتھ مدینہ منورہ کی اس سوسائٹی کو زندہ کرنا چاہیے جس نے رسول اکرمؐ کی قیادت میں خواتین کا مرتبہ اور مقام متعین کیا تھا۔ قرآن کریم کی تعلیمات کا رازداں آپؐ کے بعد صحابہ کرامؓ کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ بلاخوف لومتہ لائم اس سماج کے طرز عمل اور طرز فکر کی تجدید کرنا چاہیے۔ چاہے اس کے نتیجے میں ہماری پسندیدہ چیزوں کو خیرباد کہنا پڑے اور اس طرز فکر کو بدلنا پڑے جسے ہم نے تاریخی عمل کے تحت مذہبی جواز عطا کر دیا ہے۔

بعض دین دار حلقوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ مدینہ کی سوسائٹی عفیف اور پاکیزہ سوسائٹی تھی لیکن ہم ایسے دور میں رہ رہے ہیں جہاں اباحیت کا غلبہ ہے، اس لیے ہمیں مزید پابندیاں لگانی پڑیں گی۔ بعض مباحات کو ممنوع قرار دینا ہو گا اور اجتماعی تعامل کی بعض راہوں کو بند کرنا پڑے گا جو اس پاکیزہ سماج میں موجود تھیں۔ مگر یہ نقطۂ نظر دو وجوہ سے ناقص ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ مدینہ کی سوسائٹی میں بھی غلط عناصر موجود تھے اگرچہ ان کی تعداد حد درجہ قلیل تھی۔ قرآن کریم کی آیت حجاب خود اس امر پر شاہد ہے۔ جلباب کا حکم اس طرح دیا گیا کہ:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِىُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ (الاحزاب ۳۳:۵۹) اے نبیؐ، اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے زنا کی سزا بھی نافذ فرمائی جو اس امر کی دلیل ہے کہ اس سماج میں بھی شیطانی وساوس بعض افراد کے قدموں میں لغزش کا سبب بن سکتے تھے۔ اس کے باوجود بھی سوسائٹی میں خواتین کا کردار غیر فطری طور پر محصور نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان کو وہ سارے حقوق عملاً عطا کیے گئے جو

قرآن میں مذکور تھے اور جن کو رسول اکرمؐ نے اپنے اسوہ سے ثابت کیا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے احکام ہر معاشرے کے لیے ہیں، وہ مدینہ منورہ کا پاکیزہ سماج ہو یا آج کا اباحیت زدہ ماحول۔ اللہ تعالیٰ نے خواتین کا مقام اور ان کے حقوق متعین کرتے وقت ابدی مصالح کا خیال رکھا تھا نہ کہ وقتی ظروف و احوال کا۔

یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ ان معروضات سے یہ ہرگز مراد نہیں ہے کہ بعض حالات میں شریعت کے عمومی مصالح کے تحت شرائط اور پابندیاں نہیں لگائی جا سکتیں بلکہ صرف اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ حدود و قیود نہ تو خودساختہ ہونے چاہییں اور نہ رسم و رواج سے متاثر ہونے چاہییں بلکہ قرآن و سنت سے مستنبط اور ماخوذ ہونے چاہییں۔ اس لیے کہ مصالح کا علم خدا اور رسولؐ سے بہتر کس کو ہو سکتا ہے؟ دوسری بات یہ ذہن نشین کرانا ہے کہ اسلام کی اصل فراخی اور کشادگی ہے، پابندیاں اور حصار نہیں۔ طٰهٰ ○ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى ○ (طٰهٰ ۲۰: ۱-۲) طٰہٰ، ہم نے یہ قرآن تم پر اس لیے نازل نہیں کیا ہے کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔

پابندیوں کا نتیجہ اگر یہ نکلے کہ جو حقوق اور مراتب اللہ اور اس کے رسولؐ نے خواتین کو عطا کیے ہیں وہ غیر موثر ہو جائیں، یا جو آزادی اللہ اور اس کے رسولؐ نے خواتین کو عطا فرمائی ہے وہ قیدوبند میں بدل جائے، تو اس کا نتیجہ جمود ہو گا۔ جمود کی کیفیت سے تحفظ بھی ممکن نہیں، اس لیے کہ فطرت جمود سے ابا کرتی ہے یا تو قدم آگے بڑھیں گے یا انحطاط ہو گا۔

اثبات اور اقدام کی اس جدوجہد کے دو اہم اجزا ہیں:

ایک جز، تو قرآن و سنت کی بنیادی قدروں اور اس کی تعلیمات کا اثبات ہے۔ مدینہ منورہ کی اس سوسائٹی کا اتباع ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین کے زمانے میں قائم تھی اور تاریخی سفر کے ثقافتی حشو و زوائد سے نجات حاصل کرنا ہے۔

دوسرا جز، دور حاضر کے ظروف و احوال کا خالص اسلامی نقطۂ نظر سے تجزیہ کر کے صحت مند اور انسانیت عامہ کے لیے مفید رجحانات کا تعین ہے۔ ان میں سے درج ذیل رجحانات ہماری فوری توجہ کے طالب ہیں۔ ان میں سے بعض صحت مند ہیں اور بعض فساد کا موجب۔ پہلے ان رجحانات کو لیجیے جو اصلاً صحت مند ہیں۔

۱۔ خواتین کی عمومی مظلومیت اور ضعف کو دور کرنے اور ان کو انسانی حقوق دلانے کی عام جدوجہد۔
۲۔ اجتماعی امور میں ان کے اشتراک میں اضافے کی جدوجہد۔
۳۔ خواتین کے درمیان جہالت کو دور کرنے اور تعلیم کے ممکنہ وسائل بہم پہنچانے کی جدوجہد۔
۴۔ عائلی زندگی میں خواتین کو منصفانہ حقوق دلانے کی جدوجہد۔

۵۔ عام سماجی نقطۂ نظر کی اصلاح جو عورت کو مرد سے فروتر سمجھتا ہے۔ بچی کی پیدائش کو بوجھ اور لعنت سمجھتا ہے اور جہیز کو رشتہ ازدواج کا لازمی جز قرار دیتا ہے۔

۶۔ معاشی زندگی میں عورت کو استقلال عطا کرنے کی جدوجہد۔

عصر جدید کے مذکورہ بالا رجحانات آج خواتین کی تمناؤں اور آرزوؤں کا مظہر ہیں۔ یہ اپنی اصل کے اعتبار سے اسلامی نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہیں۔ حالانکہ خدائی ہدایات سے بے نیازی نے ان کی تعبیر میں افراط اور تفریط کی راہ پیدا کی ہے۔

ہر صاحب علم مسلمان جانتا ہے کہ قرآن و سنت نے مذکورہ بالا قدروں کو انسانیت کی تاریخ میں پہلی بار وہ مقام عطا کیا ہے جن کی وہ مستحق تھیں۔ اس نے مرد اور عورت دونوں کو ایک ہی جوڑے سے پیدا ہونے کی وجہ سے یکساں مقام عطا کیا۔ اس نے پہلی بار عورت کا مستقل وجود تسلیم کیا ہے اور تمام حقوق و فرائض کا ان کو یکساں مخاطب قرار دیا۔ اس کے تعین میں خواتین کے خصوصی دائرہ کار اور ان کے طبعی فرق کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ لیکن عام انسانی حقوق میں دونوں کو برابر قرار دیا گیا ہے۔ اس نے تکالیف شرعیہ کا مخاطب دونوں کو الگ الگ قرار دیا۔ اس نے اخروی عتاب اور ثواب میں دونوں کا الگ الگ وجود تسلیم کیا۔ اس نے پہلی بار عیسائیت کے غیر عادلانہ تصور کا قلع قمع کیا جس کی رو سے عورت فی نفسہ معصیت تھی بلکہ شیطانی وساوس کا مورد دونوں کو بتایا۔ اس نے مرد اور عورت دونوں کے حقوق الگ الگ تسلیم کیے۔ عورتوں کو معاشی استقلال عطا کیا۔ اجتماعی امور میں ان کے مشورے اور آواز کو جائز اور قابل قدر مقام دیا۔ فریضہ امربالمعروف اور نہی عن المنکر میں ایک دوسرے کا اولیا قرار دیا۔ جہاد اور قتال میں ان کی شرکت کو ممنوع نہیں قرار دیا بلکہ بعض صحابیہ کی بہادری اور حوصلہ مندی کو رسولؐ نے سراہا۔ لڑکیوں کی تربیت اور تعلیم کو جنت کی ضمانت قرار دیا۔ بحیثیت ماں اسے اعلیٰ ترین مقام دیا۔ خلافت کے مسئلے میں بھی ان کی رائے اور مشورے کو اہمیت دی۔ یہاں ان بنیادی تعلیمات کا اعادہ مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہ گزارش کرنا ہے کہ مذکورہ بالا رجحانات اپنی اصل کے اعتبار سے اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ ہیں۔

تحریک اسلامی کو ان رجحانات کی صرف تائید نہیں کرنا چاہیے۔ محض تائید تو یہ تاثر دیتی ہے کہ آپ تبع ہیں حالانکہ آپ کا کردار یہ چاہتا ہے کہ آپ ان قدروں کے داعی اور علم بردار ہوں اس لیے کہ قرآن و سنت ان کے علم بردار ہیں۔ لیکن ان رجحانات کو بلاسوچے سمجھے اپنانا بھی غلط ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان رجحانات کے داعی بالعموم دین و مذہب سے بے گانہ افراد ہیں۔ ان کی جدوجہد میں فکری ژولیدگی ہے۔ ان کی عملی تعبیر میں خواہشات اور تجدید پسندی کی آلودگی بھی ہے۔ افراط اور تفریط بھی ہے اور ردعمل بھی۔ متوازن اور عادلانہ فکر صرف اسلام عطا کرتا ہے۔ اگر ہم کوشش کریں تو اسلامی تعلیمات کے طفیل ان قدروں کا متوازن امتزاج اس طرح پیش کر سکتے ہیں جو عصری اصطلاحات کی زبان میں سمجھا جا سکے۔

دور حاضر میں بعض رجحانات فساد اور عدم استحکام کا بھی موجب ہیں۔ ان رجحانات کا فروغ انسانیت عامہ کے لیے ہلاکت کا پیغام ہے۔ وہ اخلاق' انسانیت' مروت اور رحمت کو جڑ سے اکھاڑ کر انسانی روابط کو مارکیٹ کی قدروں کی بنیاد پر استوار کرنا چاہتے ہیں۔ بدقسمتی سے ان رجحانات کے فروغ اور اشاعت کی پشت پر مغربی طاقتیں ہیں۔ اقوام متحدہ ہے' ذرائع ابلاغ ہیں' بے خدا فلسفہ زندگی ہے' اباحیت زدہ کلچر ہے۔ اس سیلاب کو ٹکنالوجی کی حیرت ناک ترقی نے ہر ہر لمحے غذا پہنچائی ہے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ اس سیلاب کے داعی مرد زیادہ ہیں اور عورتیں کم۔

ان میں سے چند اہم رجحانات کا ذکر ذیل میں ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ سب سے اہم رجحان وہ ہے کہ جو عائلی زندگی اور اس کے ضوابط کو خواتین کی مظلومیت کا اصل سبب قرار دیتا ہے۔

۲۔ یہ خاندان کے قدیم تصور کو بدل کر اس کو والدین میں سے صرف والدہ کو محور بنانا چاہتا ہے۔ یعنی صرف ایک خاتون اور اس کے بچے پر مشتمل خاندان کو قانونی اور سماجی جواز دلانا چاہتا ہے۔

اس تصور کے حق میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ تولیدی آزادی (reproductive freedom) خواتین کی خود اختیاری کا جزولاینفک ہے۔ جنسی عمل کی حریت اسے کسی خاص مرد کے تابع نہیں بناتی اور نہ اس کو بچہ پیدا کرنے کی مشین بناتی ہے۔ ان کے نزدیک مرد کے روایتی ظلم کا موثر ترین ذریعہ روایتی خاندان ہے' لہٰذا اس کو ختم کر دیا جائے تاکہ عورت کو آزادی حاصل ہو جائے۔ نہ خاندان ہو گا' نہ مرد کی حکومت' نہ خانہ داری اور نہ ہی تولیدی عمل کی مجبوری۔

۲۔ دوسرا رجحان یہ ہے کہ عورت اور سماج کے درمیان حقوق کی لڑائی کو فروغ دیا جائے۔ مردوں اور عورتوں کے حقوق کو ہر میدان میں برابر قرار دیا جائے اور صنف کے فرق کی وجہ سے سماج نے حقوق میں جو تفریق روا رکھی ہے اسے یکسر ختم کر دیا جائے۔ اسی طرح ایک منصفانہ جدوجہد کو حقوق کی دست برد میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس رجحان کا سب سے پہلا شکار فرائض اور وظیفہ حیات کا فرق بن گئے ہیں۔

اس رجحان کا شاخسانہ یہ بھی ہے کہ خواتین کو ہر میدان میں مکمل جدوجہد اور مسابقت کا اختیار ملنا چاہیے۔ سیاست' معاش' تعلیم' انتظامی امور' مالیات وغیرہ سارے میدان ان کے لیے کھلے رہنے چاہییں جس میں وہ اپنے انتخاب کے مطابق جتنا وقت چاہیں صرف کریں۔

اس مطالبے کا معکوس یہ ہے کہ مردوں کو بچوں کی نگہ داری' خانہ داری اور تربیت کی ذمہ داری سنبھالنا چاہیے بلکہ اگر ٹکنالوجی کے ذریعے ممکن ہو تو مردوں کو عمل تولید کا ذمہ دار بھی بنا دیا جائے۔

۳۔ تیسرا رجحان وہ ہے جو ہر فرد کی قیمت کو اس کی مادی اہمیت سے ناپتا ہے اور ہر تعلق کو مادی مفادات سے جوڑتا ہے۔ چنانچہ اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے UNDP نے خواتین کی اہمیت کا پیمانہ قومی آمدنی

میں ان کے کردار کو قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک اگر قومی آمدنی کے تخمینے میں خواتین کی اندرون خانہ خدمات کو شمار کرلیا جائے تو ان کا حصہ ۴۹ فی صد بنتا ہے۔ انھیں قوی امید ہے کہ اگر خواتین کے بیرون خانہ خدمات میں اضافے کا رجحان جاری رہا تو آیندہ چند سالوں میں ان کا تناسب ۵۱ فی صد ہو جائے گا اور مردوں کا ۴۹ فی صد۔ اس طرح قومی آمدنی میں خواتین کا تناسب بڑھ جانے کی وجہ سے ان کی قوت میں اضافہ ہو گا۔

یہ رجحان سارے انسانی روابط کو مارکیٹ روابط بنانے کے درپے ہے۔ اس طرح ہر انسانی رابطے کی قدر و قیمت مالی مفادات قرار پا جائیں گے۔ خانہ داری ہو یا شوہر کی خدمت، بچوں کو دودھ پلانا ہو یا ان کی تعلیم و تربیت، ان سب کی مالی قدر و قیمت معلوم کر کے خواتین کو اپنا مقام اور مرتبہ متعین کرنا چاہیے۔

ان کے نزدیک عورتوں کی مظلومیت اور ضعف کا حقیقی سبب اخلاق، عصمت و عفت، پاکیزگی، وفاداری، ایثار کیش، خدمت گزاری کی وہ اخلاقی قدریں ہیں جنھوں نے عورت کے اختیار اور انتخاب پر بے جا پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ اس لیے ان کو ختم کرنا چاہیے۔ اقوام متحدہ کی قاہرہ کانفرنس میں اس نقطۂ نظر کو نہایت حسین اصطلاحات کے ذریعے پیش کیا گیا تھا۔ اس ضمن میں اسقاط کا فلسفہ بھی پوری قوت سے پیش کیا گیا۔ ان کے نزدیک ان اخلاقی قدروں کی ظالمانہ گرفت کو ختم کیے بغیر آبادی پر کنٹرول ممکن نہیں۔

مذکورہ بالا رجحانات ہر طرح کے مذہب، دین اور اخلاق کی نفی ہیں۔ یہ رجحانات فی الواقع مغرب کی بیمار، مادہ پرست اور اخلاق باختہ تہذیب کی پیداوار ہیں۔ ان کی اشاعت اور فروغ کا حقیقی محرک دراصل اس تہذیب کو دنیا کی دوسری تہذیبوں بالخصوص اسلامی تہذیب پر غالب کرنا ہے۔ ان رجحانات کو بظاہر خوشنما سائنسی اور معقولیات پر مبنی دلائل کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔ ان کا سدباب تحریک اسلامی کا فریضہ ہے، ملت اسلامیہ کی ذمہ داری ہے، اور علما کا نصب العین ہے۔ ان رجحانات کے سدباب کے لیے ضروری ہے کہ ان کے دلائل کا کھوکھلا پن واضح کیا جائے اور اسلامی تہذیب اور عام انسانی سماج کے لیے ان کی ہلاکت خیزی کو مبرہن کیا جائے۔ ان منفی رجحانات کا تفصیلی جائزہ اور ان کے بالمقابل اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت اس مضمون میں طوالت کے خوف سے نہیں کی جا رہی ہے۔

---

# اخوان المسلمون: ۱۹۵۲ کے بعد

## مشاہدات و تاثرات

ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی

اخوان المسلمون پر محمد شوقی ذکی کی کتاب کا ترجمہ ۱۹۵۷ میں مکتبہ الحسنات رام پور سے شائع ہوا تھا۔ اب ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی نے اپنے اس ترجمے کا دوسرا ایڈیشن شائع کروایا تو مقدمے میں بعد کے دور کے مدوجزر بیان کیے جو ذاتی معلومات کی بنا پر اخوان پر ایک قیمتی مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ اختصار کی خاطر کچھ حصے حذف کیے گئے ہیں۔ (مدیر)

عصر حاضر میں دنیا کی شاید ہی کوئی ایسی تحریک ہو گی جو جبر و قہر' قید و بند' دار و رسن اور کینہ و عداوت کے ایسے ابتلا سے گزری ہو جس سے یہ تحریک گزری اور پھر بھی وہ زندہ و فعال ہو۔ میں جس طرح مصر میں اخوان المسلمین کے کامران و مقبول ایام کا شاہد ہوں' اسی طرح ان کے ان ایام ابتلا کا بھی عینی شاہد ہوں۔

اخوان سے میرا تعلق مصر جانے سے قبل مکہ مکرمہ سے شروع ہو چکا تھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۵۰ میں استاذ معظم مولانا علی میاں صاحب مدظلہ اور مرشدی مرحوم و مغفور حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری کی معیت میں حج پر گیا اور وہاں تعلیمی غرض سے میرا قیام تین سال رہا۔ اسی سال مصر سے اخوان المسلمین کے ایک جواں سال رہنما استاذ سعید رمضان بھی آئے ہوئے تھے۔ مولانا مدظلہ کے شاگرد اور کارکن کی حیثیت سے میرا بھی موصوف سے تعارف ہوا' جو بعد میں مصر و شام اور جنیوا (سوئٹزرلینڈ) میں برسوں قائم رہا۔ میں نے اس اثرانگیز' سحر آفریں اور شعلہ بار اخوانی رہنما و خطیب (یہ تحریک اخوان المسلمین کے بانی و قائد حسن البنا شہید کے داماد بھی تھے) کو جو پیشے کے لحاظ سے ایک وکیل تھے' پہلی بار مکہ مکرمہ ہی میں سنا۔

مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران عربی زبان و دینی علوم کی تحصیل کے علاوہ میرا یہ کام بھی تھا کہ حج کے موقع پر عالم عرب کے لوگوں سے تعلقات پیدا کروں۔ دوسرے حج کے موقع پر مصر سے اخوان کا ایک وفد اسکندریہ یونی ورسٹی کے ایک استاد ڈاکٹر عبدالعزیز کامل کی قیادت میں آیا۔ اس میں اسکندریہ یونی ورسٹی اور قاہرہ یونی ورسٹی کے طلبہ حج پر آئے ہوئے تھے' ان میں سے قاہرہ یونی ورسٹی کے ایک طالب علم محب الدین المحجوری سے میرا گہرا تعلق ہو گیا' خط و کتابت رہی۔

پھر جب اگست ۱۹۵۳ میں مصر گیا تو ان محب المحجوری سے ملا۔ میں شروع میں وسط شہر میں قصر عابدین کے پاس شارع عبدالعزیز پر ایک فلیٹ میں بعض پاکستانی طلبہ کے ساتھ مقیم تھا' تنہا تھا اور کمرے کا کرایہ بھی زیادہ تھا' محب المحجوری جو شہر کے کنارے پر ایک نو آباد محلہ الدقی میں رہتے تھے' مجھے بہ اصرار اپنے اس فلیٹ میں لے گئے جو اگرچہ شہر سے دور تھا لیکن کشادہ اور ارزاں تھا اور اس میں ان کے ساتھ مصر کے دوسرے شہروں سے آئے ہوئے چار اور اخوانی نوجوان بھی رہتے تھے۔ محب المحجوری اپنا کمرہ چھوڑ کر اپنے ایک عزیز کے یہاں جا رہے تھے' مجھے ان کا کمرہ مل گیا۔ اس فلیٹ میں ان اخوانی رفقا کے ساتھ میں نے مصر میں ڈیڑھ سال کا عرصہ گزارا جو میرے لیے بہت اہم تھا۔ الدقی کے اس فلیٹ میں میری اس سادہ اخوانی نوجوان عبداللطیف سے بھی صرف ایک بار ملاقات ہوئی جو پیشے کے اعتبار سے ایک پلمبر تھا اور جس پر ہفتہ عشرہ بعد یہ الزام لگایا گیا تھا کہ اسی نے جمال عبدالناصر پر اسکندریہ کے ایک جلسے میں گولی چلائی تھی۔ یہ کیسا مہمل اور بے سروپا الزام تھا' اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو میری طرح اس سادہ انسان سے ملے تھے' یا اس کے قریب تھے۔ بہرحال اس کو گرفتار کر کے چند ماہ بعد ہی فوجی عدالت نے پھانسی کا حکم سنا دیا تھا۔

میں اس کے بعد دل برداشتہ ہو کر مصر سے واپس چلا آیا اور قاہرہ یونی ورسٹی کے کلیہ دارالعلوم میں میرے داخلے کا معاملہ اس طرح ادھورا رہ گیا۔ کسی عرب یونی ورسٹی میں تعلیم کا شوق اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے بعد میں دمشق میں پورا کرایا۔

میں اس طرح اخوان کے محلہ دقی کے ایک اُسرہ (یونٹ یا cell) کا ایک فرد بن گیا تھا۔ اکثر منگل کے روز ہفتہ وار اجتماع میں اخوان کے (مرکز) الحلمیہ الجدیدہ میں جایا کرتا تھا۔ اس عمومی جلسے میں اخوانی رہنما یا باہر کے آئے ہوئے مہمان تقریریں کیا کرتے تھے' یہیں ایک بار میں نے ایران کی تحریک فدائیان کے نوجوان اور جرأت مند رہنما نواب صفوی کو عربی میں تقریر کرتے سنا۔ اس انقلابی لیڈر کی تقریر بڑی فصیح و بلیغ اور اثر انگیز تھی' اللہ اکبر کے ہزاروں نعروں سے اخوان کا مرکز گونج رہا تھا' چند سال بعد ہی شاہ ایران نے ان کو پھانسی دے دی تھی۔

انھی دنوں اسی مرکز اخوان میں تحریک کے قائد یعنی مرشد عام اخوان المسلمین، جسٹس ریٹائرڈ حسن الھضیبی صاحب سے مجھے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ تحریک کے بانی اور پہلے مرشد عام کی ۱۹۴۹ میں مصری خفیہ پولیس کے ہاتھوں شہادت کے بعد یہ دوسرے مرشد عام منتخب ہوئے تھے۔ موصوف مرحوم مصر کے سپریم کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج تھے، عمر ۶۵ سال کے قریب تھی۔ بعد میں جب جمال عبدالناصر کے ہاتھوں اخوان پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹا اور قید وبند اور ریاستی تشدد کا ایک لامتناہی سلسلہ ۱۹۵۴ میں شروع ہوا تو اس بوڑھے ریٹائرڈ جج اور نرم خو اور نرم گفتار دینی رہنما کو پھانسی کی سزا سنائی گئی جو بعد میں ۲۵ سال کی قید بامشقت سے بدل دی گئی۔ کئی برس بعد وہ رہا ہوئے اور ۱۹۷۴ میں وفات پائی۔

**اخوان المسلمین اور انقلاب مصر:** میں جب مصر پہنچا تھا تو شاہ فاروق کے خلاف مصری انقلاب کو صرف ایک سال ہوا تھا۔ یہ وقت مصر میں اخوان کی مقبولیت کا اہم دور تھا اس لیے کہ مصری بادشاہت کے خلاف، جو انگریزوں کا وہاں زبردست سہارا تھی، اخوان بہت سرگرم تھے۔ وہ متعدد بار انگریزوں کے اشاروں پر ناچنے والی مصری حکومتوں سے ٹکر لے چکے تھے۔ فلسطین کی ۱۹۴۸ کی ناکام جنگ میں حصہ لینے کے بعد سے وہ مصری فوجی و سیاسی قیادت کے خلاف، اس کی ناقص کارکردگی اور غداری کی بنا پر بعض مصری فوجی افسران کے ساتھ خفیہ طور پر سرگرم تھے۔ کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ جولائی ۱۹۵۲ کے مصری فوجی انقلاب میں جمال عبدالناصر اور انور سادات وغیرہ کے ساتھ اخوان سے خفیہ طور پر وابستہ بعض اعلیٰ فوجی افسران کا بہت اہم رول تھا۔ میں اس کو ذاتی طور پر جانتا ہوں اور ان افسران کے نام بھی میرے ذہن میں ہیں جو جمال عبدالناصر سے بلند مرتبہ یا اس کے ہم پلہ اور رفیق کار تھے۔ جنرل رشاد مہنا، کرنل ابو المکارم عبدالحی، کرنل عبدالرؤف، عبدالمومن وغیرہ۔

غرض مصر کے فوجی انقلاب کے بعد، اس انقلاب میں اخوان کی شرکت کے سبب حکومت میں ان کی مقبولیت کا یہ سنہرا دور تھا۔ جمال عبدالناصر اور انقلابی کونسل نے اخوان کو بعض وزارتیں بھی پیش کی تھیں لیکن اخوان کی قیادت نے اپنی دینی و فکری شرائط کے تسلیم نہ کیے جانے کے سبب محدود وزارتوں کی اس پیش کش کو رد کر دیا تھا۔ بہرحال ابتدائی دو سالوں میں انقلابی حکومت سے ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ صدر جنرل نجیب، جمال عبدالناصر اور دیگر وزرا، انقلاب کے بعد شہید حسن البنا کی چوتھی برسی کے موقع پر ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے بھی گئے تھے۔

**انقلابی حکومت کی مخالفت اور اخوان پر ظلم و ستم:** جمال عبدالناصر کے استبدادی اقدامات اور اشتراکی افکار کے سبب اخوان اور فوجی قیادت میں اختلاف کی خلیج پیدا ہوئی۔ اخوان جمہوری طرز کی حکومت اور انتخابات کے حامی و داعی تھے لیکن جمال عبدالناصر نے اندرونی سازش سے اسلام پسند صدر جنرل نجیب

کو حکومت سے بے دخل کیا' انتخابات کو غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کیا' ملک کو اسلامی روش پر ڈالنے اور حکومت کو اسلامی طریقے پر چلانے سے گریز کیا۔ اختلاف کی یہ خلیج اس وقت بہت وسیع ہو گئی جب مصر میں مقیم انگریزی افواج کے انخلا پر انگریزوں سے گفت و شنید ہو رہی تھی۔ اخوان ان نرم شرائط کے خلاف تھے جن پر جمال عبدالناصر اور اس کے ہم نوا انقلابی کونسل کے ارکان تیار تھے۔

انگریزوں سے اس مسئلے پر مذاکرات میں مصر کے ہندستانی سفارت خانے نے اہم رول ادا کیا تھا۔ میرا یہ انکشاف یقیناً نیا ہو گا۔ یہ میں سنی سنائی باتیں بیان نہیں کر رہا ہوں بلکہ ذاتی معلومات کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ میں اس وقت ہندستانی شہری تھا۔ ایک پرانے ہندستانی سیاسی کارکن اور مولانا ابوالکلام آزاد اور سبھاش چندر وغیرہ کے پرانے رفیق اور کانگریسی مسلمان عبداللہ المصری اس زمانے میں مصر آئے ہوئے تھے۔ موصوف نے مجھ سے کہا کہ میں قاہرہ میں ہندستانی سفیر علی یاور جنگ بہادر کو عربی پڑھا دوں۔ میں دو بار ان کو عربی پڑھانے سفارت خانے (زمالک میں) گیا' دریں اثنا وہ نیویارک اقوام متحدہ چلے گئے۔ سفارت خانے کے ملٹری اتاشی کرنل مدن نے اس موقع پر مجھ سے عربی پڑھنے کے لیے کہا۔ کوئی ایک ماہ کے قریب ان کو ابتدائی عربی پڑھائی تھی کہ انھوں نے یہ کہہ کر آیندہ کے لیے معذرت کر لی کہ وہ انگریزی افواج کے مصر سے انخلا کے مذاکرات میں مصری قیادت کے ساتھ مصروف ہیں۔ اسی زمانے میں مصر یا جمال عبدالناصر کی انڈیا اور نہرو سے دوستی بڑھی جو روس کی طرف جھکاؤ کے بعد مضبوط تر ہوتی گئی اور پاکستان سے مصر کے تعلقات خراب یا سرد ہوتے چلے گئے' جب کہ مصری فوجی انقلاب کی ابتدا میں یہ تعلقات انتہائی قریبی' برادرانہ اور مضبوط تھے اور اخوان تو اسلام کے رشتے کے سبب پاکستان کے شیدائی تھے۔

مجھے یاد ہے کہ جنوری ۱۹۵۴ میں اخوان کے موجودہ نومنتخب معمر مرشد عام اور اس وقت کے نوجوان مصطفیٰ مشہور نے محلہ منیل الروضہ میں اخوان کی مسجد الشریف میں اسی مسئلہ انخلا پر نماز جمعہ کے خطبے سے قبل ایک پرجوش تقریر کی جس میں فوجی حکومت پر سخت تنقید کی۔ نماز مصطفیٰ مشہور صاحب ہی نے پڑھائی لیکن نماز کے فوراً بعد جب کہ ابھی نمازی مسجد ہی میں تھے' پولیس نے گولی چلائی جس سے بھگدڑ مچ گئی۔ میں بھی اپنے اخوانی رفیق حسین اسکندرانی کے ساتھ بچ نکلنے میں کامیاب ہوا۔ بہت سے لوگ گرفتار ہوئے' مصطفیٰ مشہور بھی گرفتار ہوئے لیکن بعد میں انھیں چھوڑ دیا گیا' یہ پھر دوبارہ اگست ۱۹۵۴ میں گرفتار ہوئے اور ۱۰ سال کی قید ہوئی' یہ ایک الگ کہانی ہے۔

ان دنوں مصری خفیہ پولیس کے لوگ ہمارے فلیٹ کی نگرانی کیا کرتے تھے۔ جولائی ۱۹۵۴ میں انقلاب کی دوسری سالگرہ کے موقع پر جمال عبدالناصر نے اسکندریہ کے اپنے جلسے میں ایک ڈراما رچایا۔ اس جلسے میں اس کی خفیہ پولیس کے کارندوں نے فائرنگ کی' جس سے اس کو مطلقاً کوئی گزند نہیں پہنچی لیکن اخوان

کو اس میں متہم کیا گیا۔ مذکورۂ بالا اخوانی پلمبر عبداللطیف کو گرفتار کر کے اور اس پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا کر ایک دو ماہ میں پھانسی دے دی گئی اور اخوان پر سخت داروگیر ہوئی۔ ان کے خلاف ٹیلی وژن' اخبارات (جو سب قومیا لیے گئے تھے) میں مہم چلائی گئی' سرکاری غنڈوں کے ذریعے ان کے مرکز کو جلوا دیا گیا' اخوان کی تمام قیادت کو گرفتار کر لیا گیا' جن میں سرکردہ وکلا' علما' بڑی کمپنیوں کے مالکان اور یونی ورسٹیوں کے پروفیسر شامل تھے۔ یہ سب اس لیے کیا گیا کہ اخوان کی اشتراکی رجحانات کی مخالفت کو ہمیشہ کے لیے کچل دیا جائے۔

یہ بات مصری فوجی قیادت کو اچھی طرح معلوم تھی کہ اخوان کی ایک رضاکارانہ نیم عسکری تنظیم (النظام الخاص) کے پاس فلسطین کی ۱۹۴۸ کی لڑائی کا بچا ہوا کافی اسلحہ تھا جو مصری حکومت کی اجازت سے انھوں نے جمع کیا تھا اور کچھ حکومت کی طرف سے بھی ان کو دیا گیا۔ جمال عبدالناصر اور اس کے بہت سے فوجی رفقا جو فلسطین کی اس پہلی ناکام جنگ میں شریک تھے اس بات سے واقف تھے۔ اب انتہائی بددیانتی کے ساتھ الزام یہ گھڑا گیا کہ اخوان نے یہ اسلحہ انقلابی حکومت کو عمومی بغاوت کے ذریعے غیر قانونی طور پر ختم کرنے کے لیے جمع کیا تھا اور ان کا منصوبہ یہ تھا کہ فوجی قیادت کے ارکان کو قتل کر کے رجعت پسند (reactionary) حکومت قائم کر دی جائے۔ اس زمانے میں "رجعیہ" (رجعت پسندی) کی سرکاری ذرائع ابلاغ میں بہت رٹ لگائی جاتی تھی اور اس پردے میں دین داری اور اسلام پسندی کے خلاف کافی زہر اگلا جاتا تھا۔

میں اس موقع پر ایک اور راز سے پردہ اٹھانا چاہتا ہوں جس کو پاکستان اور ہندستان میں شاید ہی کوئی جانتا ہو اور وہ یہ کہ اخوان المسلمین کی امن پسند اسلامی تحریک کو تباہ و برباد کرنے کے لیے یہ ساری کارروائی امریکہ کی مدد سے کی گئی۔ ۱۹۶۷ کی مصر اسرائیل جنگ اور مصر کی ذلت آمیز شکست کے بعد' جو مصری فضائی قوت کی اسرائیل کے ایک اچانک حملے میں مکمل تباہی کے نتیجے میں واقع ہوئی' ایک اسرائیلی خفیہ ایجنٹ نے ایک کتاب شائع کی تھی جس کا عربی ترجمہ عندما تحطمت الاسراب' میں نے اس جنگ کے کچھ ہی ماہ بعد بن غازی میں پڑھا تھا۔ کتاب کا انگریزی نام شاید یہ تھا: When the Squadrons were Crushed۔ مصنف نے جو اس دوران مصر میں اسرائیل کے لیے کامیاب جاسوسی کرتا رہا تھا اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ مصر کے فوجی انقلاب کے بعد جو شرق اوسط میں انگریزوں کے قدیمی تسلط کو ختم کرنے کے لیے امریکہ کی موافقت سے ہوا تھا' جمال عبدالناصر نے مصری خفیہ پولیس کے بدلے جو انگریزوں کی تیار کردہ اور مصری بادشاہت کی خدمت گار تھی' ایک نئی خفیہ پولیس منظم کرنے کے لیے امریکہ سے مدد مانگی۔ امریکہ میں اس وقت جرمنی سے بھاگے ہوئے بہت سے نازی پولیس افسران موجود

تھے۔ امریکہ نے ان کو مصر بھیج دیا۔ ان میں سے کچھ نازی بظاہر مسلمان ہو گئے اور انھوں نے اپنے نام مفتی فلسطین محمد امین الحسینی کے نام پر محمد امین رکھ لیے تھے۔ یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران الحاج امین الحسینی انگریزوں کی گرفت سے بھاگ کر جرمنی چلے گئے تھے اور انگریزی استعمار کے خلاف برلن ریڈیو سے پروپیگنڈا کرتے تھے۔ اس طرح جو جرمن بھی ان کا نام لے یا یہ کہے کہ ان کے ہاتھوں مسلمان ہوا تھا' مسلمانوں اور خاص طور پر اخوان المسلمین میں بہت محبوب تھا۔ اس طرح یہ جھوٹے نازی جرمن مسلمان وزیر داخلہ زکریا محی الدین کی منصوبہ بندی کے تحت اخوان کے اندر گھسا دیے گئے اور ان کو یہ مہم سونپی گئی کہ وہ اخوان کی صفوں میں بحیثیت جرمن مسلمان سرایت کریں اور ان کی نیم عسکری تنظیم کو ٹریننگ کے لیے اپنی خدمات پیش کریں اور اس طرح اخوان کی اس تنظیم کے پاس موجود اسلحہ کی رپورٹ مصری حکومت کو بہم پہنچائیں۔ یہ کام انتہائی رازداری اور مہارت کے ساتھ کیا گیا۔ اس طرح جمال عبدالناصر کی فوجی حکومت نے اخوان کی اس نیم عسکری خفیہ تنظیم کے اسلحے کے بارے میں جو تفصیلی معلومات حاصل کیں' اسکندریہ کے جلسے میں جمال عبدالناصر پر سازشی طور فائرنگ کے ڈرامے کے بعد جو فوجی انقلابی عدالت تشکیل دی گئی' اس کے سامنے رکھ دی گئیں۔ اس طرح اخوان کو بدنام کیا گیا' ان کے خلاف مقدمے تیار کیے گئے اور چند ماہ میں چند سرکردہ اخوانی لیڈروں' مشہور وکیل اور ممتاز قانون دان و مصنف عبدالقادر عودہ' ازہری عالم شیخ فرغلی جیسے چھ افراد کو پھانسی دے دی گئی۔ انقلابی کونسل کا وہ رکن اور انقلابی عدالت کا وہ سربراہ یعنی کرنل جمال سالم جس نے ان پاک نفوس کو پھانسی کا حکم سنایا تھا' جلد ہی بعد پاگل ہو کر نیویارک کے ایک ہسپتال میں مرا۔

جس کسی کو بھی اخوان المسلمون کی تحریک کو کچلنے میں امریکہ کے جمال عبدالناصر کے ساتھ تعاون میں شک ہو' وہ امریکی محکمہ سراغ رسانی سی آئی اے کے بانی مائلز کوپ لینڈ (Miles Coopland) کی کتاب "The Game of Nations" (قوموں کا کھیل) پڑھے۔ جس میں تفصیل سے ذکر ہے کہ کس طرح امریکہ نے شام میں ۱۹۴۹ سے فوجی انقلابات کا سلسلہ شروع کرایا' اور اس بڑے امریکی جاسوس کا ان میں کیا رول تھا اور پھر اس نے کس طرح جمال عبدالناصر اور اس کے بعض قریبی ساتھیوں سے تعلقات پیدا کیے اور اس کا مصری فوجی انقلاب میں کتنا بڑا رول تھا اور وہ جمال عبدالناصر کے کتنا قریب تھا۔ یہ کتاب ۶۰ کے عشرے کے اوائل میں چھپی تھی' اور مصر' شام' عراق میں اس کا داخلہ ممنوع تھا۔ عربی میں بھی اس کا ترجمہ لعبة الامم کے نام سے بیروت میں چھپا تھا۔ انقلابی مصر کے تعلقات امریکہ سے ۱۹۵۴ کے اواخر میں اس وقت خراب ہوئے جب امریکی وزیر خارجہ ڈالس نے واشنگٹن جانے والے مصری وفد کو صرف دو ملین ڈالر کی امداد پیش کی جس کو مصر کی انقلابی حکومت نے اپنی اہانت سمجھا۔ اس کے بعد جمال عبدالناصر نے روس سے

فوجی امداد کی درخواست کی اور تعلقات بڑھائے۔ اس میں انقلابی کونسل کے ایک کمیونسٹ رکن خالد محی الدین نے اہم کردار ادا کیا اور انڈین گورنمنٹ یا خود نہرو نے روس کے ساتھ اپنے رسوخ کو استعمال کیا۔ بالآخر جمال عبدالناصر کے عہد میں مصر کلیتہً روس کے پہلو میں جاگرا لیکن چونکہ اسرائیل کے ساتھ اختلافات حل کرانے اور فلسطین کے مسئلے میں سویٹ روس کوئی موثر عملی مدد نہ کر سکا' اس لیے اپنی وفات سے چند ماہ قبل ماسکو کے سفر سے واپسی پر جمال عبدالناصر نے اپنے نائب صدر انور سادات کو امریکہ سے ربط و ضبط بڑھانے کے لیے سبز اشارہ (green signal) دے دیا تھا۔ بالآخر جمال عبدالناصر کی موت کے بعد مصر امریکہ کی گود میں جاگرا' اسرائیل کو بھی اس نے تسلیم کر لیا اور اس سے سفارتی تعلقات قائم کر لیے۔ اس طرح مصری انقلاب کے وقت امریکہ سے جو دوستی قائم ہوئی تھی' اب وہ دوبارہ برسوں سے پورے عروج پر ہے اور مصری حکومت جس کا سربراہ عرصے سے ایک سابق فوجی افسر ہے' اب امریکہ کے اشارۂ ابرو پر ناچتی ہے۔ امریکہ نے نہایت ہوشیاری سے صلیبی عداوت کے زیر اثر اخوان کی تحریک کو' جو مغربی اثرات کو قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھی' خود ان مصری انقلابیوں سے کچلوا دیا۔

جمال عبدالناصر نے اپنی حکومت میں ہمیشہ ایک ایسے آدمی کو رکھا جس کے امریکہ سے خفیہ روابط تھے اور وہ تھا وزیر داخلہ زکریا محی الدین جس نے' جیسا کہ اوپر ذکر ہوا' امریکہ سے نازی پولیس افسران حاصل کیے تھے پھر یہی زکریا محی الدین تھا جو ۱۹۶۷ میں مصر کی غیر متوقع تباہ کن جنگ کے وقوع سے ایک دو روز بعد ہی مصر و اسرائیل کے درمیان انتہائی کشیدہ حالات کو امریکہ کی وساطت سے درست کرانے اور جنگ کے منڈلاتے ہوئے خطرات کو دور کرنے کے لیے واشنگٹن جانے والا تھا کہ اچانک اسرائیل نے جون کی ایک صبح سویرے زبردست فضائی حملہ کر کے سارے مصری لڑاکا اور بمبار ہوائی جہاز برباد کر دیے۔ فضائی فوج کے سربراہ کی طرف سے رات بھر برپا رہنے والی راگ و رنگ کی ایک پارٹی کے بعد فضائی افسر اس صبح نشے میں دھت سوئے ہوئے تھے۔

لہٰذا امریکہ کی مدد سے مصری انقلابیوں کے ہاتھوں اخوان المسلمون کی تباہی و بربادی میں کسی شک و شبے کی گنجایش نہیں' کیونکہ صرف اخوان ہی مصر میں ایک ایسی سیاسی و عمومی طاقت تھے' اور اب بھی ہیں' جو ایک طرف لادین کیمونزم اور سوشلزم کے موثر مخالف اور دوسری طرف مغربی سیکولرزم اور مغربی ثقافت کے اثرات کے سخت دشمن تھے اور ہیں۔

جہاں تک امریکہ کی جمہوریت پرستی اور جمہوریت دوستی کے دعووں کا تعلق ہے تو یہ مسلمان ملکوں کے لیے نہیں۔ وہ ان ممالک میں فوجی انقلابات برپا کراتا رہا یا ان کی تائید کرتا رہا ہے۔ مذکورہ بالا امریکی جاسوس مائلز کوپ لینڈ کی کتاب میں پیش کردہ شواہد کے علاوہ تازہ واقعہ الجزائر کا ہے جہاں منصفانہ انتخابات

میں تین سال قبل اسلامک فرنٹ کی کامیابی سے ناخوش ہو کر امریکہ نے فوجی حکومت قائم کرا دی اور برابر اس کی تائید کر رہا ہے اور سادے لباس میں فوجیوں کے ہاتھوں وہاں بے گناہ لوگوں کا آئے دن قتل عام ہو رہا ہے اور اس کا الزام ظالمانہ طور پر وہاں کی اسلامک فرنٹ کے کارکنوں پر ڈالا جاتا ہے۔ اس گھناؤنے جرم میں فرانس بھی ملوث ہے۔

ابھی چند ماہ قبل ایک الجزائری فوجی افسر نے لندن میں سیاسی پناہ حاصل کرنے کے بعد وہاں کے اخبار آبزرور کو انٹرویو دیا ہے کہ اس نے الجزائری فوجی حکومت کی طرف سے پیرس میں ایک تنظیم کو پانچ لاکھ فرانک دیے تھے۔ اور دوسرا تازہ ترین واقعہ ترکی کا ہے جہاں فوج نے ایک جمہوری منتخب وزیراعظم نجم الدین اربکان کو برطرف کر دیا۔ اس وزیراعظم کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ اور اس کی پارٹی اسلام پسند ہے اور اس نے ایران سے ایک بہت بڑا اقتصادی معاہدہ کیا تھا۔ امریکہ نے اس منتخب جمہوری حکومت کی برطرفی پر کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا بلکہ فوجی مداخلت کی حمایت ہی کی۔

**اخوان المسلمین کا دوسرا دور ابتلا :** اگست ۱۹۵۴ کے مصنوعی واقعے کے بعد اخوان کی داروگیر اور ابتلا کا جو دور شروع ہوا اس کے نتیجے میں حکومت اور کمپنیوں میں ملازم ہزاروں اخوانی نوجوان جیلوں میں بھر دیے گئے' ۱۰ سے لے کر ۲۰' ۳۰ سال تک کی سزائیں ان کو دی گئیں۔ ہزاروں لوگ خفیہ طریقوں سے سوڈان اور لیبیا فرار ہو کر وطن سے دربدر ہو گئے۔ اس سال کا مجھے اپنے دوست محب المحجری کا ایک واقعہ یاد ہے۔ وہ ان دنوں نئے انقلابی روزنامے الجمہوریہ میں کام کرتا تھا اور ہمارے پاس ہر ہفتے آتا رہتا تھا' اچانک وہ غائب ہو گیا۔ پھر ایک ماہ بعد آیا تو سر گھٹا ہوا تھا۔ ایک راضی برضا رہنے والے نوجوان ثابت قدم مومن کی طرح اس نے ہمیں بتایا کہ اخبار کے ایڈیٹر (انقلابی فوجی افسر) انور سادات کے اشارے پر اسے گرفتار کیا گیا اور اگرچہ اس پر کوئی الزام نہیں تھا لیکن اسے تفتیش کے لیے تین ہفتے جیل میں رکھا گیا' اس کا سر مونڈ دیا گیا اور اس پر کوڑے برسائے گئے۔ پھر اس نے اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی' کوڑوں کے مار کے اثر سے ساری پیٹھ نیلی ہو رہی تھی اور کہیں کہیں سے کھال ادھڑ گئی تھی۔ اس نے مصری پولیس کی تعذیب (torture) کے جو واقعات بتائے تو اس سے دل لرز گیا تھا' جس میں برف کی سلوں پر ننگا کر کے گھنٹوں لٹانا' مقعد کی راہ سے سائیکل کے پمپ سے پیٹ میں ہوا بھرنا اور کئی کئی راتیں تیز روشنی کے بلب لگا کر سونے نہ دینا' اور پھر سب سے زیادہ تکلیف دہ یہ کہ صبح و شام ماں بہن کی گالیاں دے کر تذلیل کرنا' اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ بعض اخوانیوں کی ماؤں اور بہنوں کو جیل خانے میں بلا کر ان کی عصمت دری ان قیدی اخوانیوں کے سامنے کرنا۔

یہ سب ایذا رسانی اور تعذیب کے وہ طریقے تھے جو نازی افسران نے امریکہ سے آکر مصری پولیس کو

سکھائے تھے اور جو جیل خانے کی دیواروں سے باہر نکل کر ہر مصری کی زبان پر تھے۔ اس حکومتی دہشت گردی کا مقصد یہ تھا کہ اخوان کی تحریک کو ہمیشہ کے لیے کچل دیا جائے مگر مصری اشتراکی جلاد جمال عبدالناصر اس میں ناکام رہا۔ اس کی منصوبہ بندی یہ بھی تھی کہ جو اخوان جیلوں میں بھر دیے گئے ہیں ان کی بیویاں اور بچے فقر و فاقے سے مجبور ہو کر اپنے شوہروں' بھائیوں' بیٹوں کو حکومت کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کریں مگر جو اخوانی مصر سے بھاگ کر ہزاروں کی تعداد میں سعودی عرب' کویت' سوڈان' شام وغیرہ میں گئے تھے' وہ اپنی آمدنی سے اپنے گھر والوں کے علاوہ ان بے سہارا خاندانوں کی بھی مدد کرتے رہے۔ انھی میں استاذ سعید رمضان بھی تھے' جن کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں اور جو اُن دنوں قاہرہ میں ماہنامہ المسلمون نکالتے تھے۔ یہ ۱۹۴۸ سے دو تین سال کراچی میں رہ چکے تھے' جب اخوان کے مرشد عام حسن البناؒ شہید نے ان کو اُس دور میں قید و بند سے بچنے کے لیے پاکستان بھیج دیا تھا۔

مصر کے بعد شام میں اخوان المسلمین کی تنظیم بہت طاقت ور تھی۔ دمشق یونی ورسٹی کے لا کالج میں اسلامی قانون کے پروفیسر اور بعد میں کلیتہ الشریعہ کے ڈین اور میرے استاد ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی یہاں اخوان کے مراقب عام تھے۔ یونی ورسٹی میں یہ تنظیم کافی مضبوط تھی۔ مرحوم سعید رمضان اپنے خاندان کے ساتھ آگئے تھے اور یہاں سے ماہنامہ المسلمون نکالنا شروع کر دیا تھا۔ میں جب ۱۹۵۵ میں دمشق تعلیم کے لیے گیا تو اکثر ان کے گھر جایا کرتا۔ مصر کی طرح یہاں بھی اخوانی طلبہ و اساتذہ مجھ سے سگے بھائیوں کا سلوک کرتے تھے لیکن مصر کے اخوانی رفقا کی بات ہی کچھ اور تھی۔

اخوان پر ۱۹۵۴ میں مصری انقلابی حکومت نے جو مظالم کیے اور ان کی تحریک کو ممنوع قرار دیا' اس کے صرف دو سال بعد ۱۹۵۶ میں جمال عبدالناصر کے نہر سویز کو قومیانے پر برطانیہ' فرانس اور اسرائیل مصر کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور مصر کو جنگ کی دھمکیاں دی جانے لگیں۔ اس موقع پر اخوان نے اپنے اوپر مصری حکومت کے انتہائی شدید مظالم بھلا کر' قومی ضرورت کے تحت حکومت کا ساتھ دیا اور اپنی خدمات پیش کیں۔ یہی وہ سال تھا جب میں نے دمشق یونی ورسٹی کے تمام طلبہ کے ساتھ وہاں فوجی ٹریننگ حاصل کی تھی۔

اچانک برطانیہ' فرانس اور اسرائیل نے مل کر مصر پر حملہ کر دیا۔ اس مختصر جنگ میں مصر کو شکست ہوئی' اسرائیل نے صحرائے سینا کا مصری علاقہ قبضے میں کر لیا اور برطانیہ و فرانس نے دوبارہ نہر سویز کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ امریکہ کے صدر آئزن ہاور کی مداخلت پر ان ممالک نے اپنی افواج اس شرط پر واپس بلائیں کہ اسرائیل کے جہازوں کو نہر سویز میں گزرنے کی اجازت دی جائے اور برطانیہ و فرانس کو نہر سویز کو قومیانے پر ان کو اِن کے حقوق کا مالی معاوضہ نہر کی آمدنی سے دیا جائے۔ اسرائیل نے بھی سینا سے اپنی

فوجیں واپس بلا لیں لیکن اس نے اپنی حدود کے قریب کچھ مصری علاقے پر قبضہ قائم رکھا۔

بہرحال اس جنگ اور اپنی شکست کے بعد مصری انقلابی حکومت نے اخوان کے خلاف اپنی عداوت میں کمی کر دی۔ اگرچہ ان کو ان کا صدر دفتر اور املاک واپس نہیں ملے لیکن اس جنگ کے موقع پر جو بے قصور اخوانی جیلوں سے رہا کر دیے گئے تھے، وہ دوبارہ استاذ سید قطب کی رہنمائی میں اپنی پُرامن اسلامی دعوت میں سرگرم ہو گئے۔ سید قطب مصر کے مشہور ادیب، نقاد اور اسلامی ذہن کے مفکر و مصنف تھے، لیکن ان کی تحریریں اور اخوان کی تحریک کا دوبارہ احیا جمال عبدالناصر کو پسند نہیں آیا اور سید قطب کو اور اسی طرح بہت سے اخوانی نوجوانوں کو بھی جو ان سے وابستہ تھے، جیل میں بند کر دیا گیا۔ بعدازاں سید قطب پر ان کی ایک کتاب **معالم فی الطریق** کو بنیاد بنا کر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا کہ یہ کتاب مصری حکومت کے خلاف اکسانے والی ہے۔ پھر ان کو ۱۹۶۶ میں پھانسی کی سزا دے دی گئی، جب کہ دوسرے سیکڑوں اخوانیوں کو قید کی سزا دی گئی۔

اس طرح یہ اخوان کا دوسرا دور ابتلا تھا جس میں ان کے سب سے بڑے مفکر و مصنف کو جس نے جیل میں کئی سال کی محنت سے بیسویں صدی کی بے نظیر تفسیر **فی ظلال القرآن** لکھی تھی، شہید کر دیا گیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے صرف ایک سال بعد ہی اسلام کے لیے اپنی جان دینے والوں اور قیدوبند کے مصائب اٹھانے والوں کا انتقام ۱۹۶۷ کی جنگ میں اسرائیل کے ہاتھوں مصر کی انتہائی ذلت آمیز شکست میں لیا، ہزاروں مصری فوجی قید ہوئے، مصری فوج کا عیاش سربراہ خودکشی کر کے مرا۔ مصر کی روس سے دوستی کسی کام نہ آئی اور ۱۹۷۰ میں جمال عبدالناصر بھی دنیا سے رخصت ہوا۔

**اخوان المسلمین جمال عبدالناصر کے بعد:** ۱۹۶۷ سے سینا کے وسیع مصری علاقے پر اسرائیل کا قبضہ تھا، ساتھ ہی نہر سویز کا پورا مشرقی ساحل ان کے تسلط میں تھا۔ ان کی اجازت سے ہی تمام ممالک کے جہاز نہر سویز سے گزر سکتے تھے۔ انور سادات چاہتا تھا کہ کسی طرح اسرائیلی افواج کو نہر سویز کے مشرقی ساحل سے ہٹائے، اس کے لیے اس کو اپنی داخلی پالیسی بدلنا پڑی۔ اس نے ہزاروں بے قصور اخوانی قیدیوں کو جیلوں سے رہا کیا، بہت سوں کے مقدمات واپس لیے اور جمال عبدالناصر کی اشتراکیت کے بجائے اسلام کا نعرہ بلند کیا اور اپنے آپ کو الرئیس المومن کہلوایا۔ گو اخوان کی ۱۹۵۴ کے ابتلا سے پہلے کی حالت بحال نہ ہوئی اور نہ ان کو ان کی املاک واپس کی گئیں لیکن ان کو دوبارہ آزادی عمل ملی، اور ساتھ ہی وہ لاکھوں مصری جو جمال عبدالناصر کے عہد میں اشتراکیت کے نیچے پسے ہوئے تھے اور اسلام کا نعرہ بلند کرتے ہوئے ڈرتے تھے انھوں نے آزادی کی سانس لی۔ اسرائیل دشمنی میں سب مصری ایک ہوئے اور جب ہی انور سادات اس قابل ہو سکا کہ اس نے ۶/اکتوبر ۱۹۷۳ کو اچانک رات کی تاریکی میں نہر سویز کے مشرقی کنارے پر حملہ کر

کے اسرائیلی فوج کو شکست دی اور پھر بعد میں امریکہ کی مدد سے اسرائیل سے معاہدہ سینا کا وسیع علاقہ واپس لیا۔

۱۹۷۱ میں ایک پرانے اخوانی رہنما عمر التلمسانی کو ۱۷ سال بعد جیل سے رہائی ملی اور یہ ۱۹۷۴ میں اخوان کے مرشد عام منتخب ہوئے۔ انھوں نے انتہائی دانش مندی سے اخوان کی بکھری ہوئی صفوں کو دوبارہ یک جا کیا، بہت سے وہ اخوانی جن کو ۱۹۵۴ میں ۱۵، ۱۵ سال جیل کی سزا ہوئی تھی اور وہ اپنے ملک سے باہر تھے، اپنے وطن واپس ہوئے۔ دوسروں کو جیلوں سے رہائی ملی لیکن ابھی تک اخوان کو ملک میں آزاد سیاسی عمل کی اجازت نہیں ملی تھی، جب کہ دوسری پرانی سیاسی پارٹیوں جیسے وفد وغیرہ کو سیاسی عمل کی آزادی مل گئی تھی۔ اخوان نے "وفد" یا بعض دوسری نئی سیاسی پارٹیوں کے ساتھ مل کر انتخابات میں حصہ لیا اور پارلیمنٹ میں اسلامی قدروں کی آواز بلند کرنا شروع کی۔ عمر التلمسانی ہی کے دور میں مصر کے پرانے سیاسی مجلات الدعوة وغیرہ جاری ہوئے۔ ۱۲ سال تک تیسرے مرشد عام کی حیثیت سے اخوان کی قیادت کرنے کے بعد ۱۹۸۶ میں عمر التلمسانی نے وفات پائی اور حامد ابوالنصر چوتھے مرشد عام منتخب ہوئے۔

اخوان کے یہ چوتھے مرشد ۱۹۳۳ سے اخوان کی تحریک میں تھے اور ۱۹۵۴ میں ان کو ۲۵ سال کی سزا ہوئی تھی لیکن ۲۰ سال جیل میں گزارنے کے بعد ۱۹۷۴ میں رہائی ملی۔ انھی کے عہد میں اخوان نے مصری سوسائٹی میں دوبارہ اپنے وجود کو پوری طرح تسلیم کرانے کی کامیاب کوشش کی۔ مختلف پیشہ ورانہ تنظیموں، یونی ورسٹیوں کے تدریسی عملے اور قومی اداروں میں وہ پہلے کی طرح داخل ہوئے۔ ان کے عہد میں اپریل ۱۹۸۷ میں اخوان نے دو نئی مصری سیاسی پارٹیوں حزب العمل اور حزب الاحرار کے ساتھ تحالف کرتے ہوئے مصری پارلیمنٹ کے انتخابات میں حصہ لیا اور پہلی مرتبہ اخوان کے چھتیس (۳۶) ارکان پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ اس کے نتیجے میں پارلیمنٹ میں اپوزیشن کی قیادت ان کے ہاتھ میں آئی۔

ہنگامی قوانین (ایمرجنسی) پر احتجاج کرتے ہوئے اور عادلانہ و منصفانہ شفاف انتخابات کی ضمانت نہ ہونے کے باعث انھوں نے ۱۹۹۰ کے عام انتخابات کا دوسری اپوزیشن پارٹیوں کے ساتھ بائیکاٹ کیا۔ ۱۹۹۲ میں انھوں نے لوکل باڈیز کے انتخابات میں حصہ لیا۔ ۱۹۹۳ میں حسنی مبارک کے تیسری مرتبہ صدارتی انتخابات کی مخالفت کی جس کے نتیجے میں وہ حکومت کے غیظ و غضب کا شکار ہوئے اور ان کے ۸۲ ممتاز کارکنوں اور رہنماؤں پر فوجی عدالت میں مختلف جھوٹے الزامات لگا کر مقدمہ چلایا گیا اور ان میں سے ۵۴ کو جیل کی سزا دی گئی۔ ۱۹۹۵ میں انھوں نے پارلیمنٹ کے انتخابات میں حصہ لیا۔

مرشد عام حامد ابوالنصر کے عہد میں جماعت کا مکمل اداراتی اور تنظیمی ڈھانچہ شوریٰ کی بنیاد پر ۴۰ سال بعد دوبارہ قائم ہوا۔ اخوان کی اعلیٰ ترین تنفیذی کمیٹی "مکتب الارشاد" کے ممبران اور مرشد عام کا انتخاب

عمل میں آیا۔ حامد ابوالنصر وہ پہلے مرشد عام تھے جنھوں نے مرحوم ضیاالحق کے عہد میں ۱۹۸۸ میں اسلامک کونسل آف یورپ کے جلسے منعقدہ اسلام آباد میں شرکت کی' افغان مجاہدین کی قیادت سے ملاقات کی اور درۂ خیبر کا دورہ کیا۔ انھوں نے ۲۰ جنوری ۱۹۹۶ میں وفات پائی اور ان کے دفن کے فوراً بعد ان ہزاروں اخوانیوں نے جو تدفین میں شریک تھے' مرحوم مرشد عام کے نائب اول استاذ مصطفیٰ مشہور کے ہاتھ پر علی الاعلان اجتماعی بیعت کی۔

**اخوان کی موجودہ قیادت اور تازہ ترین صورت حال:** موجودہ مرشد عام استاذ مصطفیٰ مشہور کی عمر اس وقت یعنی ۱۹۹۸ میں ۷۷ سال ہے۔ یہ ۱۷ سال کی عمر میں جب وہ منیا کے شہر میں ثانوی اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے' اخوان کی تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے۔ استاذ مصطفیٰ مشہور نے دین کی خاطر چار مرتبہ قیدوبند کی صعوبتیں اٹھائیں۔ پہلی بار شاہ فاروق کے عہد میں وہ ۱۹۴۸ میں جیل گئے اور تین سال انھوں نے جیل میں کاٹے۔ ۱۹۵۱ میں رہائی کے بعد وہ دوبارہ جمال عبدالناصر کے عہد میں ۱۹۵۴ میں گرفتار ہوئے اور ان کو ۱۰ سال کی سزا ہوئی۔ ۱۹۶۴ میں رہائی کے بعد ان کو ۱۹۶۵ میں پھر گرفتار کر لیا گیا اور ۱۹۷۱ میں انور سادات کے عہد میں ان کو رہائی ملی۔ اس طرح انھوں نے شاہ فاروق اور جمال عبدالناصر کے عہد میں ۱۹ سال سیاسی قید میں گزارے۔

۱۹۸۱ میں جب ایک تشدد پسند نئی دینی تنظیم جماعة التکفیر والهجرة کے ہاتھوں فوجی پریڈ کے دوران انور السادات کے قتل کا حادثہ پیش آیا تو اگرچہ اخوان کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن پھر بھی بہت سے اخوانی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا کیونکہ وہ سادات کے اسرائیل کے دورے اور اسرائیل سے تعلقات قائم کرنے کے خلاف تھے تاوقتیکہ القدس کا شہر فلسطینیوں کو واپس نہ ملے۔ بہرحال حسن اتفاق سے اس وقت مصطفیٰ مشہور ملک سے باہر تھے' اس لیے گرفتاری سے بچے رہے۔ پھر جب پانچ سال بعد مصری حکومت کے شکوک و شبہات دور ہوئے اور اخوانیوں کی اس قتل میں ملوث ہونے کی برأت ثابت ہوئی تو ۱۹۸۶ میں مصطفیٰ مشہور مصر واپس آئے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جمال عبدالناصر کی وفات کے بعد مصر میں رفتہ رفتہ اشتراکیت کا بت ٹوٹا' اور ریاستی جبر و قہر میں کمی آئی اور لوگوں نے آزادی کا سانس لیا' سیاسی پارٹیوں اور دینی جماعتوں کی تشکیل کی اجازت ملی تو مصر میں جماعة التکفیر والهجرة اور الجماعة الاسلامیة کے نام سے دو نئی دینی جماعتیں وجود میں آئیں۔ مقدم الذکر جماعت تو انور السادات کے دورۂ اسرائیل اور اس سے تعلقات قائم کرنے کے خلاف ایک ردعمل کے طور پر وجود میں آئی تھی' اور اسی کے افراد نے انتہائی ماہرانہ منصوبہ بندی اور جرأت کے ساتھ انور سادات کو قتل کیا تھا۔ اس طرح اپنے مقاصد کے حصول کے لیے وہ

تشدد کے قائل تھے اور یہی فکر الجماعۃ الاسلامیۃ کی بھی ہے۔ مصر میں گذشتہ چند سالوں میں غیر ملکی سیاحوں کے جو متعدد غیر انسانی اور افسوس ناک قتل کے واقعات ہوئے ہیں ان میں یہی دو جماعتیں یا اور تشدد پسند دینی عناصر ملوث رہے ہیں۔ اخوان المسلمین کا ان سے کوئی تعلق نہیں' اور نہ ان کے انداز فکر اور منہج عمل میں تشدد کا کوئی گزر ہے۔ جماعۃ التکفیر والھجرۃ کو مصر میں غیر قانونی قرار دینے کے بعد ایک اور تشدد پسند جماعت تنظیم الجہاد کے نام سے قائم ہوئی ہے۔

اسی لیے استاذ مصطفیٰ مشہور نے اپنے منتخب ہونے کے فوراً بعد کویت کے مشہور اور کثیرالاشاعت ہفتہ وار مجلہ المجتمع کو جو تفصیلی انٹرویو دیا تھا' اس میں بہت وضاحت کے ساتھ اس بات کا اعلان کیا تھا کہ ہمارا الجماعۃ الاسلامیۃ اور تنظیم الجہاد سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہم تشدد کے کسی صورت میں قائل ہیں۔

"ہمیں بدنام کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے ہم سے تشدد پسندی کی باتیں منسوب کی جاتی ہیں' لیکن حکومت کبھی بھی یہ ثابت نہ کر سکی کہ ہمارا مذکورہ بالا تشدد پسند دینی تنظیموں سے کوئی تعلق ہے' بلکہ ہم تو ہمیشہ تشدد پسندی کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ جب سے ۷۰ کی دہائی کے اوائل میں ہم جیلوں سے رہا ہوئے ہیں' ملک میں تشدد کے کتنے ہی واقعات ہو چکے ہیں لیکن کسی ایک واقعے میں بھی کوئی اخوانی شریک نہیں ہوا"۔

استاذ مصطفیٰ مشہور نے جو کچھ مزید المجتمع کے نمایندے سے ۱۹۹۶ کے اس انٹرویو میں کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ گذشتہ نصف صدی سے اخوان پر حکومت کے ہاتھوں نازل ہونے والے مصائب سے ہراساں نہیں اور نہ ان کو بالآخر اپنے نیک مقاصد کی کامیابی میں کوئی شک و شبہ ہے کیونکہ "ہماری زندگی کے امور کا فیصلہ صرف بشری عوامل (human factors) کا مرہون منت نہیں ہوتا بلکہ اس میں الٰہی عوامل (divine factors) ہمیشہ کار فرما ہوتے ہیں اور وہ تائید الٰہی سے مایوس نہیں اور نہ کسی سچے مسلمان کو ہونا چاہیے"۔ انھوں نے یہ بات بہت زور دے کر کہی کہ اخوان بلکہ تمام مسلمانوں کو اس بات سے مطلقاً ہراساں و مایوس نہیں ہونا چاہیے کہ اسلام دشمن قوتیں جو ہر جگہ اسلام کامل کے خلاف نبرد آزما ہیں' ان کے پاس ہتھیار ہیں' توپیں' ٹینک اور ہوائی جہاز وغیرہ ہیں' جب کہ مسلمان کمزور اور انتشار پسندی کا شکار ہیں۔ کیونکہ "ہم امور زندگی کو مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے' الٰہی عامل کو ہمیں اپنی فکر کا محور قرار دینا چاہیے۔ اصل کار فرمائی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور نصرت اسی کی طرف سے ہوتی ہے اور مستقبل بالآخر اسلام ہی کا ہے کیونکہ یہی وہ دین ہے جس کو اللہ نے ساری بشریت کے لیے روز قیامت تک پسند فرمایا ہے۔ اس لیے مخالفین خواہ کچھ بھی کر لیں وہ اس دین کو ختم نہیں کر سکتے۔ ہمیں اپنے سینوں میں امید کی

شمع روشن رکھنا چاہیے اور جو کچھ پیش آئے اس پر صبر کرنا چاہیے اور ثابت قدم رہنا چاہیے اور ہمیں اس پر پورا یقین ہونا چاہیے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہمیں کبھی بھی چھوڑ نہیں دے گا"۔

یہ الفاظ پہلی بار کسی اخوانی لیڈر یا مرشد کے منہ سے نہیں نکلے' بلکہ پہلے ہی دن سے مرشد عام حسن البنا شہید کے زمانے میں یہی ان کے الفاظ اور یہی ان کا یقین اور انداز فکر و عمل رہا ہے' اور یہی وجہ ہے کہ گو ان پر مختلف ادوار میں مصائب کے پہاڑ ٹوٹے اور بظاہر ان کی تحریک کو ہمیشہ کے لیے کچل دیا گیا لیکن ان کے اخلاص' صبر اور پامردی کے نتیجے میں نصرت الٰہی نے ان کا ساتھ دیا اور ان کو حیات نو ملی۔ اسی الٰہی عامل پر ایقان اور دل میں امید کا چراغ روشن رکھنے کے سبب اخوان المسلمون گذشتہ نصف صدی سے انتہائی مشکل حالات کا مقابلہ کرتے رہے ہیں اور بالآخر تائید خداوندی سے سرخرو ہو کر نکلے ہیں۔

دو تین ماہ قبل حسن البنا شہید کے چھوٹے بھائی جمال البنا جو مصر میں مزدوروں کی بہبودی کی تنظیم کے صدر ہیں' پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے تھے' موصوف کی عمر کوئی ۷۸ سال کی ہے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ اخوان اب بھی حکومت کے معاندانہ رویے کا شکار ہیں' نہ تو آج تک ان کو ان کے کروڑوں روپے کی مرکزی بلڈنگ کا معاوضہ ملا ہے' نہ ان کی بیسیوں کمپنیوں اور فیکٹریوں کے مالکان کو ان کی املاک کا کوئی معاوضہ ملا ہے' اور نہ ان کو سیاسی عمل کی آزادی ہے۔

ہمارے ملک کے بیشتر لوگ اخوان کی کارکردگی سے ناواقف ہیں۔ انھوں نے نہ صرف مصر' بلکہ شرق اوسط اور یورپ میں آج سے نصف صدی قبل اسلامی بیداری اور اسلام سے لگن کی وہ عظیم لہر دوڑا دی تھی کہ ان عرب ممالک میں قائم ہونے والی اشتراکی اور فوجی حکومتیں بھی اس کو نہ دبا سکیں۔ مصر میں ۱۹۵۴ اور بعد میں ۱۹۶۶ میں جو ظالمانہ اور وحشیانہ سلوک ان کے ساتھ کیا گیا' اس کی دھندلی سی تصویر گذشتہ سطور میں آ چکی ہے اور پھر تائید خداوندی سے جمال عبدالناصر کی موت کے بعد سے وہ موت و حیات کی کش مکش سے نجات پا کر مصر میں آزادی کی سانس لے رہے ہیں' جب کہ شام و عراق کی فوجی اشتراکی حکومتوں نے ان کو تباہ و برباد کرنے کی جو کارروائیاں کیں' ان پر بے پناہ مظالم ڈھائے' ان کو اپنے وطن سے دربدر کیا' اور ان کی سرگرمیوں پر کڑی پابندیاں لگائیں وہ آج بھی قائم ہیں' کیونکہ یہ فوجی حکمراں تقریباً ۳۰ سال سے اب تک مسلط ہیں۔ لیکن سوڈان اور اردن میں بحمداللہ اخوان کے لیے میدان عمل کھلا ہوا ہے اور اب ان کی سرگرمیاں یورپ و امریکہ میں بھی پوری آب و تاب کے ساتھ جاری ہیں۔

میں یہ طویل مقدمہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے اس قول پر ختم کرتا ہوں: لا یحبھم الاّ مومن ولاَ یبغضھم الاّ منافق یعنی "ہر صاحب ایمان اخوان سے محبت رکھتا ہے اور صرف منافق ہی ان سے دشمنی رکھتے ہیں" (تحریک الاخوان المسلمون ماضی و حال: ناشر مجلس نشریات اسلام' ناظم آباد' نمبر۱' کراچی ۷۴۶۰۰)۔

8

# ذہنی دباؤ کا شکار ہونے سے بچیں

کام کا دباؤ شخصیت کو متاثر کرتا ہے۔ ذہن الجھتا ہے تو سماعت اور بصارت کی معمول کی صلاحیت بھی صحیح طرح کام نہیں کرتی۔ قلب پریشان ہو تو فیصلے غلط ہو جاتے ہیں۔

درج ذیل تدابیر کے ذریعے سے ذہنی تناؤ کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور دباؤ کی وجہ سے بہتر انداز میں کام کرنے کی صلاحیت کھونے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔

① ہر گھنٹہ میں دو تین منٹ کے لیے اپنے دل کو ذکر اور درود کے لیے خاموشی سے وقف کر دیجیے۔ بظاہر اپنے کاموں کو جاری رکھیں۔ اس طرح اندرونی طور پر آپ سکینت اور توکل سے لبریز ہو جائیں گے۔ اگر آپ کی گھڑی گھنٹے پر آواز دیتی ہو تو اس طرح یاد دہانی ہو سکتی ہے۔

② افراد سے بے نیاز ہو جائیں' ان کے ساتھ احسان کریں اور بھول جائیں۔

③ کسی مقصد کے حصول کے لیے مشکل کے بجائے آسان راستے کا انتخاب کریں۔ نئے راستوں سے خائف نہ ہوں۔ سوچ کو تبدیل کرنے کے لیے آمادہ رہیں۔

④ خوف' محرومی' زیادتی' تکلیف' کینہ' کدورت' رنج' دکھ' حسد' غصہ' نفرت' دشمنی' جیسے جذبات کو حاوی نہ ہونے دیں۔ منفی کے بجائے مثبت رخ سامنے رکھیں۔ جذباتی طور پر پراگندگی سے بچیں۔

⑤ مسکراہٹ' مزاح' تفریح سے ذہن کو تازگی بخشیں۔ نیند ضروری ہوتی ہے۔ غذا ہلکی رکھیں۔ زندگی کو کثرتِ آسائش سے بوجھل نہ بنائیں۔

⑥ ہر صبح نیا آغاز کریں۔ گزرے ہوئے کل کے بجائے آنے والے کل پر نظر رکھیں۔ فطرت کے حسین مظاہر سے لطف اندوز ہونے کے مواقع کا اہتمام کریں۔

⑦ خاندان کے درمیان وقت کو یکسوئی کے ساتھ خاندان کے دائرے ہی میں توجہ کرتے ہوئے گزاریں۔ باہر کے مسائل اندر نہ لائیں۔

# اسلامی قوانین کی ترویج و تنفیذ

## عہد فیروز شاہی کے ہندستان میں

سلیم منصور خالد ٭

انسانی زندگی ایمان و عمل اور نظم و ضبط کے سائے تلے خوش گوار رہ سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی رہنمائی کے لیے جو بہترین ہدایت عطا فرمائی' وہ اسلام ہے' قرآن ہے: "اسلام ایک جامع نظام حیات ہے۔ اس کے اصول و ضوابط انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہیں۔ مذہبی' سیاسی' معاشرتی' معاشی' انفرادی' اجتماعی' ملکی اور بین الاقوامی مسائل کا کوئی ایسا حصہ نہیں ہے' جس سے متعلق شریعت اسلامی میں رہنمائی نہ ملتی ہو۔ اسلام اپنے ماننے والوں سے مطالبہ کرتا ہے' کہ وہ اپنی زندگی کے ہر شعبے میں اس کے اصولوں کو اپنائیں اور ان کی ترویج و تنفیذ کے لیے سنجیدگی سے کوشش کریں۔ اس میں نہ صرف ان کی بھلائی اور کامیابی ہے' بلکہ دوسرے لوگوں حتیٰ کہ اس ضابطہ حیات کو تسلیم نہ کرنے والوں کے لیے بھی خیرو فلاح مضمر ہے" (اسلامی قوانین کی ترویج و تنفیذ ' ص ۷)۔ اسی لیے اہل اسلام "دنیا کے جس حصے میں بھی اختیار و اقتدار کے مالک بنے' اور حکمرانی کے منصب تک پہنچے' انھوں نے کسی نہ کسی حد تک اسلامی قوانین کے نفاذ میں حصہ لیا.... بحث و مباحثہ [اور] مختلف ذرائع سے فقہ اسلامی کی اشاعت کا اہتمام کیا" (ایضاً ' ص ۸)۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی نے اپنی کتاب "اسلامی قوانین کی ترویج و تنفیذ --- عہد فیروز شاہی کے ہندستان میں" میں اس امر پر داد تحقیق دی ہے کہ مسلمانوں' خصوصاً سلاطین دہلی کے دور حکومت (۱۲۰۶-۱۵۲۶) میں اسلامی شریعت کے نفاذ کے لیے کیا کوششیں اور کاوشیں ہوئیں۔ یہ سمجھنا کہ اسلامی قوانین کی تنفیذ اور اس کا مطالبہ کوئی نئی بات ہے' جسے چند لوگ اٹھا رہے ہیں' درست نہیں ہے۔ مختلف

---

٭ پروفیسر' ایف سی کالج' لاہور

زمانوں، مختلف معاشروں اور مختلف مسائل سے نبرد آزما مسلمانوں نے ہر عہد میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ اسلامی شریعت کے منشا کو سمجھیں اور اس کے نفاذ کے لیے بامعنی کوششیں کریں۔ تاریخ کے اس عمل اور ماضی کے قابل قدر فقہا کی اس جاں کاہی کا سراغ لگانا مسلمان مورخین کی دینی ذمہ داری ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں تاریخ محض تخت نشینی کی جنگوں اور عمارتوں کی تعمیر کا عنوان بن کر رہ گئی ہے۔

اس کتاب کے مصنف نے ثانوی مآخذ پر اعتماد کرنے کے بجائے، معاصر اور اصل عربی و فارسی مآخذ تک رسائی حاصل کی، اور مغرب یا مغرب کے زیر اثر پروان چڑھنے والی تاریخ نویسی کی روایت سے ذرا ہٹ کر، اپنے موضوع پر کام کر کے یہ حیرت انگیز تصویر ہمارے سامنے پیش کی ہے۔ اس طرح انھوں نے تاریخ کے ایک فراموش شدہ باب کو زندہ حقیقت کے طور پر پیش کیا ہے۔ "اس کتاب میں عہد وسطیٰ کے ہندستان سے متعلق ایک اہم پہلو پر مطالعہ و تحقیق کے نتائج پیش کیے گئے ہیں" (ایضاً، ص ۷)۔

صورت حال جاننے کے لیے کتاب کے یہ مقامات مددگار ثابت ہوتے ہیں: "اس دور کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عہدہ قضا [عدلیہ] پر مامور علما کی نظر کتنی بلیغ اور دور رس تھی، اور وہ لوگ غیر جانب دار اور دبدبہ شاہی سے بے خوف ہوتے تھے" (ایضاً، ص ۵)--- "دور سلاطین دہلی میں دہلی ماہرین فقہ کا مرکز بن گیا، جس کی واضح شہادت برنی، قلقشندی، العمری اور ابن بطوطہ وغیرہم کے بیانات سے ملتی ہے" (ایضاً، ص ۴)۔ مصنف نے ان مختلف مآخذ سے استفادہ کر کے واقعات کو صحیح تناظر میں پیش کیا ہے۔

مسلمانوں یا مسلم حکمرانوں کی تاریخ پر تبصرہ کرتے وقت عموماً جذباتی رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ لیکن مصنف نے ایسا راستہ اختیار کرنے کے بجائے حس انصاف کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وہ لکھتے ہیں: "یہ حقیقت اپنی جگہ درست ہے کہ مسلم حکمرانوں کی شخصی و عوامی زندگی کلی طور پر اسلامی تعلیمات اور اسلامی روایات کی آئینہ دار نہیں تھی، نہ ان کی حکومت کے تمام شعبوں میں شرعی قوانین جاری و ساری تھے۔ لیکن اسی طرح یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ان کے ہاں عام طور پر اسلامی شریعت کا احترام اور اسلامی اقدار کا پاس و لحاظ پایا جاتا تھا۔ پورے عہد وسطیٰ کے ہندستان میں ایک دو حکمرانوں کو چھوڑ کر باقی تمام سلاطین اور بادشاہان وقت اصولی طور پر شریعت کی بالادستی کے قائل تھے، اور کچھ نے عملی طور پر اسے برتنے کی سنجیدہ کوششیں بھی کیں--- [بعض] نے بسااوقات شریعت کے قوانین کی خلاف ورزی کی، لیکن شاید ہی کوئی ایسی مثال ملے گی کہ انھوں نے علانیہ شریعت سے انکار کیا ہو--- [اسی طرح] یہ کہنا بھی صحیح نہ ہو گا کہ سلاطین نے انتظامی امور اور دوسرے معاملات میں مفتیوں اور علما کی آرا کو ہمیشہ قبول کیا، لیکن درپیش مسائل میں شریعت کا نقطہ نظر معلوم کرنے میں ان کی دلچسپی سے انکار نہیں کیا جا سکتا" (ایضاً ص ۹-۱۰)۔ دوسری جانب صورت یہ ہے کہ: "جدید مورخین، تجزیہ کار اور محققین عہد سلاطین [اور عہد عثمانی

خلافت] کی تاریخ کے پہلوؤں کو اکثر نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اس سے زیادہ تلخ حقیقت یہ ہے کہ جدید مسلم دانش ور اور اہل قلم بھی اس جانب کم ہی توجہ دیتے ہیں" (ایضاً، ص ۸)۔

برعظیم میں، دور سلاطین میں، یہ خطہ زمین اسلامی شریعت کے مختلف قوانین سے آشنا ہوا اور یہاں پر اشاعت دین کا دائرہ وسیع ہوا۔ ظفرالاسلام نے اس عہد کے مختلف حکمرانوں کے، شریعت کے بارے میں رویے پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: "غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶-۱۲۸۷ء) امربالمعروف ونہی عن المنکر یا احکام شرعی کی ترویج کو حکمران کے بنیادی فرائض تصور کرتے تھے (ایضاً، ص ۱۲)--- علاء الدین خلجی (۱۲۹۶-۱۳۱۶ء) کے بارے میں امیرخسرو نے لکھا ہے: "ملک کو خوشی و خوش حالی نصیب ہوئی، دین کو رونق ملی اور شریعت کی قدر و قیمت بڑھی" (ایضاً، ص ۱۴)--- غیاث الدین تغلق (۱۳۲۰-۱۳۲۵ء) کے عہد حکومت میں اسلامی شریعت کی قدردانی اور احکام شریعت کے نفاذ میں دلچسپی کی وجہ سے ان لوگوں کی عزت اور وقعت کافی بڑھ گئی تھی، جو قضا و افتا کے نظام سے وابستہ تھے (ایضاً، ص ۱۵)--- محمد بن تغلق (۱۳۲۵-۱۳۵۱ء) کی شہرت ایک تجدد پسند حکمران کی سی بنا کر پیش کی جاتی ہے، مگر وہ اپنے دربار میں مامور چار مفتیوں کی حتمی رائے معلوم کیے بغیر کسی مجرم کو سزائے موت نہیں دیتے تھے (ایضاً، ص ۱۱)۔ اسی طرح نظام ریاست چلانے کے لیے انھیں اسلامی فقہ سے بھی گہری دلچسپی تھی، جس کا ایک بڑا اہم مظہر یہ ہے کہ انھیں الہدایۃ ازبر تھی (ایضاً، ص ۱۶)--- فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱-۱۳۸۸ء) کا نام اسلامی قانون کی ترویج اور تنفیذ میں دلچسپی کے لیے سب سے زیادہ مشہور ہے۔ وہ نہ صرف شخصی زندگی میں دینی تقاضوں کو پورا کرنے کے قائل تھے، بلکہ سیاسی و سماجی زندگی اور انتظامی امور میں بھی شرعی قوانین کے نفاذ کے خواہاں تھے۔ دین پسندی اور شریعت کی پاس داری میں سلاطین دہلی میں سلطان فیروز شاہ تغلق کی مثال ملنی مشکل ہے (ایضاً، ص ۱۶)--- اس کے بعد وہ فیروز شاہ تغلق کو خصوصی مطالعے کا موضوع بناتے ہوئے، مختلف میدانوں میں ان کی کاوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

مثال کے طور پر: "فیروز شاہ نے اسلامی تعلیمات کی ترویج کے لیے خصوصی توجہ دیتے ہوئے کثیر تعداد میں مدارس قائم کیے، اور ان کے اخراجات کے لیے سلطنت کے خزانے سے خطیر رقمیں صرف کیں۔ یہ مدارس نہ صرف دنیوی تعلیم و تربیت کے اہم مراکز تھے بلکہ اسلامی آداب زندگی اور معاشرتی اصولوں کی تبلیغ کا ذریعہ بھی بنے۔ اس کے علاوہ اس عہد میں اسلامی تعلیمات کی نشرواشاعت کے لیے تصنیفی و تالیفی سرگرمیاں بھی جاری ہوئیں اور حکومت کی جانب سے مصنفین و مولفین کو بھی کافی نوازا گیا۔ اسی طرح عہد فیروز شاہی کی ایک منظوم فقہی تالیف تحفۃ النصائح میں اسلام کے معاشرتی احکام کی وضاحت کی گئی ہے، اور ان تصورات و روایات کی بھی نشان دہی کر دی گئی ہے جو ہندوؤں کے زیر اثر خود مسلمانوں کی زندگی میں داخل ہو گئے تھے (ایضاً، ص ۱۲۹-۱۳۰)۔

گذشتہ روایت کی پاس داری کرتے ہوئے، معاصر علما نے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کوتاہی نہ برتی۔ انھوں نے "اپنے زمانے میں پیدا ہونے والے مختلف معاشی و معاشرتی مسائل پر فقہ کی روشنی میں اظہار خیال کیا" (ایضاً، ص ۵)--- "شریعت کی روشنی میں حکومت کے ذرائع آمدنی کا تعین اور اس کے نفاذ پر زور پہلی بار فیروز شاہ کے زمانے میں نظر آتا ہے" (ایضاً، ص ۱۱۶)--- "فیروز شاہ نے برہمنوں پر جزیے کے نفاذ کے مسئلے پر غوروفکر کے لیے علما کی ایک مجلس منعقد کی۔ برہمنوں کے معاشی و معاشرتی حالات کی روشنی میں اس مجلس نے متفقہ فیصلہ کیا کہ شریعت کی رو سے برہمن جزیہ سے مستثنیٰ نہیں قرار دیے جا سکتے۔ البتہ رہبان، مذہبی پیشوا اور معابد کے خادموں کو استثنا دیا گیا" (ایضاً، ص ۱۱۹)--- شریعت کی روشنی میں فیروز شاہ کی اصلاحات صرف اقتصادی امور تک محدود نہیں تھیں، بلکہ سماجی معاملات تک وسیع تھیں جن کا مقصد غیراسلامی رسوم کو ختم کرنے کی کوشش کرنا تھا" (ایضاً، ص ۲۵)--- گویا کہ: "علما نے نہ صرف یہ کہ عام مسائل میں شریعت کے نقطۂ نظر کو واضح کیا، بلکہ نئے مسائل پر اظہار خیال کرتے وقت اپنی مجتہدانہ فکر کو بھی استعمال کیا۔ اس کی روشنی میں بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ چودھویں صدی عیسوی کے ہندستان میں اجتہادی فکر نہ صرف زندہ تھی بلکہ سرگرم عمل بھی تھی" (ایضاً، ص ۱۲۴-۱۲۵)۔

فیروز شاہ کی متوازن اور شریعت سے قریب تر پالیسیوں کو نشانہ بنانے کے لیے عوام الناس میں ایک پروپیگنڈا مہم چلائی گئی: "کہا جاتا ہے کہ سلطان بنیادی طور پر تصوف کا مخالف تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ سلطان کو تصوف یا "وحدت الوجود" کے بجائے ان غیراسلامی افکار و نظریات سے نفرت تھی، جو ان کے داعیوں یا نام نہاد صوفیوں کے ذریعے اسلام ہی کے نام پر پھیل رہے تھے--- چودھویں صدی کے نصف آخر میں تصوف نے یہاں پر نہایت بدنما شکل اختیار کر لی تھی اور صدہا مخرب اخلاق رسمیں اور گمراہ کن بدعات عام ہو گئی تھیں" (ایضاً، ص ۱۳۵-۱۳۶)--- "سلطان نے سماجی زندگی اور درباری ماحول کے ان رسوم و رواج کے خاتمے کی بامعنی کوششیں کیں، جو اسلامی روایات کے منافی اور اخلاقی تعلیمات کے خلاف تھے" (ایضاً، ص ۱۳۵)۔

فتاویٰ فیروز شاہی اس زمانے کے بڑے چھوٹے مسائل پر ریاستی پالیسی کی آئینہ دار ہے۔ مثال کے طور پر سوال اٹھایا گیا: "ذمی و مستامن کا خون بہا ایک مسلمان کے برابر ہو گا کہ نہیں؟" جواب دیا گیا: "برابر ہو گا" (ایضاً، ص ۸۲)--- عہد وسطیٰ کے معاشرتی مسائل میں ہندو مسلم تعلقات کے مسائل بہت دلچسپ، الجھے ہوئے اور اہم تھے اور فقہی نقطۂ نظر سے حل طلب بھی۔ شرعی نقطۂ نظر سے ہندوؤں سے تعلقات و معاملات کو سمجھنے کی خاطر سلاطین و مسلم عوام نے بھی اس مسئلے میں دلچسپی لی۔ معاصر علما میں اس مسئلے پر کچھ اختلاف رہا۔ اس مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کے لیے علما نے جو سوال نامے ترتیب دیے وہ اس قدر ساۓ‌نی فک اور حقیقت حال کو معلوم کرنے کے لیے اتنے مددگار ہیں، کہ دیکھ کر ان لوگوں کی بصیرت پر

رشک آتا ہے۔ فتاویٰ فیروز شاہی کے متن سے اخذ کردہ اصل جملوں کے ساتھ یہ باب ص ۷۱ تا ۸۸ تک پھیلا ہوا ہے۔

دوسری جانب عہد وسطیٰ کے ہندستان میں ہندوؤں کے ساتھ مسلم حکمرانوں کے برتاؤ سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں اور کچھ جان بوجھ کر پھیلائی جاتی ہیں۔ اس نسبت سے مسلم دور حکومت کی تصویر بالکل مسخ کر کے پیش کی جاتی ہے--- "طرفہ تماشا یہ کہ یہ باتیں ان حکمرانوں سے زیادہ منسوب کی جاتی ہیں' جو دین پسندی' مذہبی رجحان اور شریعت کے نفاذ میں دلچسپی کے لیے معروف ہیں۔ اس مفروضے کے تحت فیروز شاہ تغلق سب سے زیادہ ہدف تنقید بنے ہیں" (ایضاً' ص ۲۴)۔

فیروز شاہ کے دور حکومت پر بحث کرتے ہوئے ممتاز مورخ ضیا الدین برنی لکھتے ہیں: "سلطان نے اس امر کو بھی یقینی بنانے کی کوشش کی کہ ایسے لوگوں کو حکومت کے مناصب نہ ملنے پائیں جو شرپسند' غیر دیانت دار' بدطینت' ناخدا ترس اور ظالم ہوں" (ایضاً' ص ۱۰۴۔ برنی تاریخ فیروز شاہی' ص ۵۷۵)۔ ڈاکٹر ایشور ٹوپا نے اپنی تصنیف ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول (ص ۷۷) میں اس حقیقت کا کھل کر اعتراف کیا ہے کہ: "گو فیروز شاہ کی حکومت اسلامی اصولوں سے لبریز تھی' لیکن عوام کی بھلائی و بہبودی اس کا سب سے بڑا فرض تھا۔ اسی اصول کے تحت اس نے تمام بے جا قوانین جن کے تحت رعایا مررہی تھی' ختم کیے۔ تمام وہ چیزیں جو شریعت کے خلاف کسی بھی شعبہ زندگی میں حکومت کو نظر آتی تھیں' دور کیں۔ اس تمام اسلامی تحریک میں جس جذبے نے فیروز شاہ کی شاہی کو زندہ کیا وہ فلاح و بہبود کے اصول تھے" (ایضاً' ص ۱۰۴-۱۰۵)۔

ظفر الاسلام نے بھارت سے اٹھنے والی اس معذرت خواہانہ' بلکہ سیکولر "فکر اسلامی" کی روایت سے کوئی اثر نہیں لیا' کہ جس میں ایک "مفکر اسلام" بھارت کے مسلمانوں کے تمام مسائل و مشکلات کا سزاوار صرف مسلمانوں کو ٹھہراتے ہیں اور بھارت ماتا کے سامنے ڈنڈوت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مصنف نے کتاب کے چوتھے باب (ہندوؤں کے ساتھ فیروز شاہ تغلق کا برتاؤ) میں کھل کر ان تمام اعتراضات اور داستانوں کو موضوع بحث بنایا ہے جو فیروز شاہ کی مبینہ "ہندو دشمنی" کے گرد گھومتی ہیں۔ پھر انھوں نے محکم دلائل کے ساتھ (ص ۸۹-۱۱۴) ہر اقدام کے جواز پر نظائر اور بصیرت کے ساتھ بحث کی ہے۔ معذرت خواہانہ تاویل کا سہارا نہیں لیا۔

ہمارے موجودہ عہد ملامت میں' لوگوں کے لیے سب سے آسان کام یہ ہے کہ وہ اپنے ماضی سے بے خبر رہیں' اور اگر باخبر ہونے کی کوشش کریں تو ان کو ماضی کی ایسی تصویر دکھائی جائے جو منفی پراپیگنڈے کی تکرار کے سوا کچھ نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں ماضی کسی صحت مند روایت کی علامت نہ بن سکے گا۔ ظفر الاسلام اصلاحی نے بڑی ہمت سے کام لیتے ہوئے ایک مثال قائم کی ہے کہ ہم مغرب اور اس کے

زیر اثر لکھے جانے والے نام نہاد "تاریخی مواد" سے اوپر اٹھ کر سوچنے، سمجھنے، دیکھنے اور حقائق کھوجنے کی کوشش کریں۔ سلطنت عثمانیہ، مسلمانوں کی تاریخ کا ایک نہایت قیمتی باب ہے، جس میں فقہ و اجتہاد کے وہ باب رقم ہوئے کہ خرد مندی عش عش کر اٹھے۔ ریاست و میدان جنگ کے وہ اصول وضع ہوئے کہ تاریخ ان سے آئینہ لے۔ مگر صرف ایک اقدام، یعنی رسم الخط کی تبدیلی سے وہ سارے کا سارا اثاثہ دریا برد ہو کر رہ گیا۔ ایک صدی بھی نہیں گزری، ان کی تمام کتب ماضی کے مزاروں میں ڈھل کر دیمک کا دسترخوان بنی ہوئی ہیں۔ ادھر برعظیم میں گذشتہ ۵۰ برسوں کے دوران خاص طور پر فارسی اور عام طور پر عربی سے رشتہ یوں کاٹا گیا کہ ہمارا تمام علمی و فکری اثاثہ کباڑ خانے کی زینت بن کر رہ گیا۔ علامہ اقبال تو ویسے ہی دسترس سے باہر ہو گئے ہیں۔ ظفرالاسلام جیسے فاضل محققین ہدیہ تبریک کے مستحق ہیں کہ جنھوں نے ہر دو زبانوں سے رشتہ انس قائم رکھا اور حقائق کی نقاب کشائی کی۔ البتہ ایک پہلو سے ضرور کمی ہے کہ، اس دور کی معاشی و سماجی صورت حال کی تفصیل سامنے نہیں آتی۔ اگرچہ قیمتی اشارات موجود ہیں۔

ہمارے جدید مورخین کے لیے یہ کتاب ایک اذان کا فریضہ ضرور ادا کر رہی ہے تاکہ وہ اسلامی نقطۂ نظر کے لیے کسی تعصب کی خاطر نہیں، بلکہ فی الواقع معروضیت کے پرچم تلے تاریخ و تجزیہ کا کام سرانجام دیں، حقیقی مآخذ تک رسائی حاصل کریں اور مختلف حکمرانوں کے دور حکومت کا جائزہ لیں۔

ڈاکٹر ظفرالاسلام اصلاحی کی اس کتاب کو ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ، نے شائع (۱۹۹۸ء) کیا ہے۔ ۱۴۹ صفحات میں کتابیات (عربی، فارسی، انگریزی) کا قابل قدر انتخاب بھی دیا گیا ہے۔

---

# فقیہ الامت شیخ مصطفیٰ احمد زرقاؒ

پروفیسر خورشید احمد

عربی کا مقولہ ہے کہ عالِم کی موت دراصل عالَم کی موت کے مترادف ہے (موتُ العَالِمِ موتُ العَالَمْ)۔ یعنی ایک عالِم کے اٹھ جانے سے گویا دنیا سونی و تاریک ہو جاتی ہے۔ جن نفوس قدسیہ کی موت پر یہ مقولہ صادق آتا ہے ان میں بلاشبہ فقیہ امت شیخ مصطفیٰ احمد زرقا کا شمار ہوتا ہے جو ریاض (سعودی عرب) میں ۳ جولائی ۱۹۹۹ کو اس جہاں رنگ و بو میں ۹۵ سال گزار کر اپنے رب حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن!

الاستاذ الفاضل شیخ مصطفیٰ احمد زرقاؒ سے مجھے دو نسبتوں سے ربط و تعلق کی سعادت حاصل رہی۔ سب سے پہلے ان سے جمعیت کے اس دور میں ملاقات ہوئی جب وہ احتفال العلماء کی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لیے مفتی امین الحسینی، شیخ مصطفیٰ سباعی اور شیخ محمد المبارک کے ساتھ شرکت کے لیے تشریف لائے اور کراچی میں ایک ہفتہ سے زیادہ قیام فرمایا۔ وہ اس وقت شام کے وزیر عدل تھے۔ ڈاکٹر سعید رمضان کی معیت میں ان تمام اکابر کے ساتھ ہاکس بے پر ایک دن گزارنے کا موقع بھی ملا۔ ان کو علمی مباحث، نجی محفل اور ہلکی پھلکی گفتگو، ہر رنگ میں دیکھنے کا موقع ملا۔ پھر ۱۹۵۸ میں پنجاب یونی ورسٹی میں جو علمی مذاکرہ (colloquium) ہوا، اس میں شیخ زرقا تشریف لائے۔ شیخ ابوزہرہ بھی اس میں شریک تھے۔ اس موقع پر ان کے ساتھ کئی دن گزارنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد درجنوں بین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمی ناروں میں ان کے ساتھ شرکت کا موقع ملا۔ یہ سلسلہ ان کے انتقال سے چند سال پہلے تک جاری رہا۔

ان سے دوسری نسبت ان کے فاضل بیٹے اور میرے عزیز ترین دوست اور ساتھی ڈاکٹر انس زرقا کے تعلق سے تھی۔ انس سے میری پہلی ملاقات ۱۹۶۹ میں ہوئی جب انھوں نے فلی ڈلفیا یونی ورسٹی سے معاشیات میں پی ایچ ڈی کی تھی اور ڈاکٹر کلین کے لائق شاگرد کی حیثیت سے علمی حلقوں میں روشناس ہو گئے تھے۔ ان سے یہ تعلق ۳۰ برسوں میں گہرا ہی ہوتا رہا اور ان کے والد نے ہر ملاقات میں

اس طرح شفقت فرمائی جس طرح اپنی اولاد پر فرماتے تھے۔ جہاں دل پر ان کے علمی تبحر اور استحضار کا گہرا نقش ہے وہیں ان کی شفقت' پیار اور التفات کی مٹھاس بھی میری یادوں کا بہترین خزانہ ہے۔

شیخ مصطفیٰ زرقاؒ علم و فضل کے ساتھ سادگی' انکسار' حلم' تدبر' پاکیزگی' بزرگی اور شفقت کا مجسمہ تھے۔ بات دھیمے انداز میں کرنا' مخاطب کی بات کو غور سے سننا' اور عزت و احترام سے اس سے اختلاف یا اسے رد کرنا' بات بحث و دلیل سے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں کرنا جس میں بڑائی کا کوئی شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔ انھیں دیکھ کر' ان سے مل کر' ان سے بات چیت کر کے سلف کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔

شیخ مصطفیٰ احمد زرقاؒ کی آخری بار زیارت جدہ میں ان کے صاحبزادے کے مکان پر ہوئی۔ ثقل سماعت کی شکایت تو تھی مگر حافظہ اسی طرح تازہ اور تابندہ۔ ہر سوال کا برمحل' مدلل اور مربوط جواب اور چھوٹی چھوٹی ذاتی باتوں تک کا استحضار۔ ہم نے سیرت پر ان کی ایک تقریر کا ترجمہ اسلامک فاؤنڈیشن سے شائع کیا تھا' اس پر اپنے تشکر کا اظہار۔ ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری یونیسکو کے لیے ایک کتاب اسلامی تاریخ پر مرتب کر رہے ہیں جس کے لیے شیخ مصطفیٰ احمد زرقاؒ نے ایک باب "فقہ اسلامی اور اس کے مکاتب کی تاریخ" پر لکھا تھا' اس کی اشاعت میں تاخیر کے بارے میں تشویش' اسلامی معاشیات پر ہماری حقیر کوششوں کی حوصلہ افزائی اور ان مساعی کی کامیابی کے لیے دعائیں--- یہ ہیں آخری ملاقات کی کچھ یادیں ؎

کچھ ایسے بھی اس بزم سے اٹھ جائیں گے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

شیخ مصطفیٰ احمد زرقاؒ ۱۹۰۴ میں حلب (شام) کے ایک دینی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ احمد زرقاؒ ایک معروف عالم دین اور ان کے دادا شیخ محمد زرقا انیسویں صدی کے شام کے چوٹی کے فقیہ تھے۔ ابتدائی تعلیم دینی مکتب میں ہوئی۔ پھر قدیم اور جدید دونوں تعلیمی سلسلوں سے بھرپور استفادہ کیا۔ الکتاب القرآنی اور مدرسہ ثانیہ شرعیہ سے دینی تعلیم اور مدرسہ الفدیرا اور المدرسہ الوطنیہ سے جدید فرانسیسی تعلیم حاصل کی۔ فقہ' قانون اور ادب میں اعلیٰ تعلیم اور تخصص حاصل کیا۔ مصر کی جامعہ فواد اول (جو بعد میں جامعہ القاہرہ بنی) کے لا کالج سے بھی ڈپلوما حاصل کیا۔ عربی اور فرانسیسی دونوں زبانوں پر مکمل عبور تھا۔ اس طرح قدیم اور جدید اور اسلامی اور مغربی دونوں مآخذ سے استفادہ کر کے فروغ علم کی وہ روایت قائم کی جو ان دونوں روایات کا سنگم ہے۔

شیخ مصطفیٰ احمد زرقاؒ نے علمی' تدریس اور تحقیقی میدان میں بھرپور زندگی گزاری۔ ان کی علمی خدمات ۷۰' ۷۵ سال پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کا خاص میدان فقہ اسلامی اور سول لا (civil law) تھا لیکن اصول فقہ سے لے کر قانون کے ہر ہر شعبے میں انھوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ان کی معرکہ آرا کتاب المدخل فی الفقہ الاسلامی اور الفقہ الاسلامی فی الثوب الجدید ہیں۔ چراغ راہ کے اسلامی قانون

نمبر میں المدخل ہی سے کئی باب ہم نے پیش کیے تھے۔ ان کے علاوہ ان کی اہم تصانیف میں احکام الاوقاف، الاستصلاح والمصالح المرسلہ فی الفقہ الاسلامی، الفعل الضار والضمان فیہ، عقد البیع فی الفقہ الاسلامی، نظام التامین والرای الشرعی فیہ، عقد الاستصناع واثرہ فی نشاط البنوک الاسلامیہ باب تمہیدی لقانون مدنی اسلامی ہیں۔

شیخ مصطفیٰ احمد زرقاؒ نے ۱۹۳۳ میں اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ پہلے حلب کے ثانویہ شریعہ میں فقہ کے استاد مقرر ہوئے، پھر دمشق یونی ورسٹی کے لا کالج میں پروفیسر ہوئے اور ۱۹۴۴ سے ۱۹۶۶ تک جامعہ دمشق میں خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۶۶ سے ۱۹۷۰ تک کویت میں موسوعة الفقہ کی تدوین کی رہنمائی کی۔ پھر ۱۹۷۱ سے ۱۹۸۶ تک جامعہ اردن، عمان میں تعلیم و تدریس و تحقیق کی خدمات انجام دیتے رہے۔ او آئی سی کے مجمع الفقہ الاسلامی کی فقہ کونسل کے رکن رہے۔ فقہ کے میدان میں ان کی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۸۴ میں شاہ فیصل ایوارڈ ان کو دیا گیا۔ آخری زمانے میں ریاض میں الراجحی بنک کے اسلامی فقہ کے امور میں مشیر رہے اور آخری وقت تک فروغ علم اور تعلیم و تحقیق میں مصروف رہے۔

شیخ مصطفیٰ احمد زرقاؒ اپنی علمی سرگرمیوں کے ساتھ شام کی تحریک آزادی، تحریک اخوان المسلمون اور امت مسلمہ کے اتحاد کی کوششوں میں بھی سرگرم رہے۔ دو بار شامی پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ وزیر عدل اور وزیر اوقاف کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ شام، اردن، کویت اور عرب لیگ کی اسلامی سول لا کی تدوین کی کوششوں میں شریک رہے۔ احیاے اسلام اور غلبہ دین کی جدوجہد دنیا میں جہاں بھی ہو، اس کے موید، حامی اور سرپرست رہے۔

بیسیویں صدی کے اگر چوٹی کے ۲۰، ۲۵ علما کی فہرست بنائی جائے تو فقہ کے میدان میں جو گراں قدر خدمات شیخ مصطفیٰ احمد زرقاؒ نے انجام دیں ان کی بنا پر اس میں ان کا نام بلاشبہ شامل کیا جائے گا۔ ان کا اصل کارنامہ فقہ کی تدوین جدید اور اصول فقہ کی روشنی میں قرآن و سنت سے بلاواسطہ استفادہ کرتے ہوئے جدید مسائل کے بارے میں اسلام کی ہدایات کی تنقیح و تدوین ہے۔ روایت سے مکمل وابستگی اور احترام کے ساتھ جدید تقاضوں کا ادراک اور اصولوں پر سمجھوتہ کیے بغیر نئے مسائل کا حل تلاش کرنا اور اس میں ندرت اور جدت انھی کا حصہ تھا۔ تفصیلی احکام کے مقابلے میں اصول اور اولیات کی روشنی میں مسائل کو دیکھنے میں انھیں خصوصی درک تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے دلائل کے ساتھ اپنے معاصر علما اور فقہا سے اختلاف بھی کیا ہے اور نئی راہیں بھی نکالی ہیں اور ان کی کچھ اولیات ایسی ہیں جن کو پھر قبول عام حاصل ہوا۔

دور جدید میں اجتہاد کے احیا کی بات تو بے شمار علما نے کی ہے لیکن شیخ مصطفیٰ احمد زرقاؒ ان علما میں سے ہیں جنھوں نے اجتماعی اجتہاد اور شورائی اجتہاد کا تصور پیش کیا اور انفرادی اجتہاد اور اجماع کے درمیان آج

کے حالات کی روشنی میں ایک نئی راہ دکھائی۔ غیر مسلم بنکوں میں مسلمانوں کی رقوم پر ملنے والے سود کے بارے میں بھی وہ ان اولیں فقہا میں سے ہیں جنھوں نے اسے غیر مسلم بنکوں میں چھوڑنے کے خلاف فتویٰ دیا۔ سود کی اسی شدت سے مخالفت کی جو علماے حق نے کی ہے' لیکن ثواب کی نیت کے بغیر مضطر مسلمانوں کی مدد کے لیے ان بنکوں سے اس رقم کو لے کر استعمال کرنے کا فتویٰ دیا۔ فرد کے لیے سود کی اس رقم کو اپنے اور اپنے خاندان پر استعمال کرنا اسی طرح حرام رہا البتہ کافروں کے ہاتھوں میں اس کا چھوڑنا انسانی نگاہ میں ایک بڑا مفسدہ ہے اور اس رقم کو اضطراری حالت میں مبتلا مسلمانوں پر صرف کرنا اولیٰ ہے۔ انشورنس حتیٰ کہ لائف انشورنس کے بارے میں بھی شیخ زرقا کی رائے منفرد تھی۔ اب اس کی تائید میں آرا بڑھتی جا رہی ہیں تاکہ ضروری تبدیلیوں کے ساتھ موجودہ معیشت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تکافل اجتماعی کا نہیں بلکہ شخصی تکافل کا نظام بھی مرتب کیا جاسکے۔ جدہ سے احرام باندھنے کے سلسلے میں بھی شیخ زرقا کا فتویٰ عام فتوے سے مختلف تھا۔ فقہ کونسل' مجمع الفقہ الاسلامی کی رودادوں میں شیخ مصطفیٰ زرقاؒ کی آرا بڑی تفصیل سے موجود ہیں جن میں انھوں نے ہرحالت حزم و احتیاط لیکن دلیل کے ذریعے بیان کی ہے' مخالف کی رائے کا احترام بھی کیا ہے لیکن اپنے اختلاف کو بھی بڑی متانت سے بیان کیا ہے۔

علمیت' متانت' شرافت' اعتدال اور توسع یہ شیخ مصطفیٰ احمد زرقاؒ کا خاص اسلوب تھا اور وہ ان کے درمیان ایک حسین توازن قائم کرنے میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ شیخ مصطفیٰ احمد زرقاؒ کی خدمات کو شرف قبولیت بخشے' ان کی بشری لغزشوں سے صرف نظر فرمائے' جنت کے اعلیٰ ترین مقامات پر انھیں جگہ دے اور امت مسلمہ میں ان جیسے علما کا سلسلہ تاقیامت جاری رکھے۔ آمین!

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

---

# اخبار امت

## مورو جہاد آزادی

محمد ظہیرالدین بھٹی

دنیا کے متعدد علاقوں میں اپنی بقا کی جنگ لڑنے والے مسلمانوں میں جنوبی فلپائن میں بسنے والے مورو مسلمان بھی ہیں۔ ان کی جدوجہد کی تاریخ طویل بھی ہے اور ایمان افروز بھی۔

مورو مسلمانوں کی اپنی حکومت اور آزاد مملکت تھی جو دو صدیوں سے زائد عرصہ تک قائم رہی۔ اسلام یہاں ۱۳۸۰ میں مسلمان تاجروں کے ذریعے پہنچا جنھوں نے جلد ہی اپنے اخلاق عالیہ اور حسن سلوک سے یہاں کے باشندوں کو متاثر کیا۔ مسلم تاجروں کی آمد کے ڈیڑھ سو سال بعد یہاں کے بڑے بڑے جزیروں سولو' مینڈاناؤ اور سلامو وغیرہ میں مسلم ریاستیں وجود میں آگئیں۔ بحرالکاہل کے سات ہزار چھوٹے بڑے جزیروں میں (جن کا مجموعی رقبہ تین لاکھ مربع کلومیٹر ہے) رہنے والے یہاں کے عوام ۱۷ مارچ ۱۵۲۱ تک اسلام کے دامن میں امن و سکون سے زندگی بسر کرتے رہے۔

سقوط اندلس کے صرف ۲۹ سال بعد' ہسپانوی استعمار نے سب سے پہلے جس علاقے کا رخ کیا وہ مورو (جنوبی فلپائن) کا علاقہ تھا۔ بداناؤ وہ پہلا جزیرہ ہے جو ہسپانوی حملے کا نشانہ بنا۔ ہسپانوی تقریباً چار صدیوں تک فلپائن پر قابض رہے۔ انھوں نے لوگوں کو جبر اور لالچ کے ذریعے عیسائی بنا لیا۔ ہسپانوی گئے تو ان کے منصوبے کو جاری رکھنے اور مکمل کرنے کے لیے امریکی آگئے۔ ۱۹۳۵ میں دولت مشترکہ کے زیر سایہ ایک عبوری حکومت قائم کی گئی جو تمام جزیروں پر محیط اور عیسائی طاقتوں کے ماتحت تھی۔ پھر ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے ۱۹۴۶ میں فلپائن کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ جاپان نے دوسری عالم گیر جنگ کے دوران فلپائن پر قبضہ کیا مگر اس جنگ میں اپنی شکست کی وجہ سے وہ جلد ہی یہاں سے نکل گیا اور پھر امریکی تسلط قائم ہو گیا۔

اعلان آزادی اور اقوام متحدہ کے اسے تسلیم کر لینے کے بعد یہاں بہ ظاہر ایک قانونی اور باضابطہ حکومت بن گئی جسے بڑی طاقتوں خصوصاً امریکہ کی حمایت و تائید حاصل تھی۔ ۱۹۴۶ سے لے کر اب تک نئے

بعد دیگرے قائم ہونے والی فلپائنی حکومتیں' اسلامی وجود کے خاتمے کے لیے اپنے منصوبوں پر سختی سے عمل کر رہی ہیں۔ وہ مسلمانوں کے تشخص کو مٹانے کے لیے' ان کے علاقے میں نئی عیسائی بستیاں بسا رہی ہیں۔ ان کی زمینوں پر قبضہ کر رہی ہیں حتیٰ کہ بعض علاقوں میں اب عیسائیوں کی تعداد ۵۰ فی صد تک پہنچ چکی ہے۔ مسلمان جو اس سرزمین کے اصل مالک تھے' انھیں بے دخل کر کے جنوبی علاقوں میں دھکیل دیا گیا ہے۔ مسلمانوں نے عیسائیوں اور امریکی سامراج کے خلاف مسلسل ۴۰ سال تک جہاد کیا۔ اب تک تین لاکھ سے زائد مسلمان جام شہادت نوش کر چکے ہیں۔

مسلمانوں کے مختلف جہادی گروپوں نے ۱۹۶۲ میں "مورو محاذ آزادی" کی شکل اختیار کی۔ یہ محاذ ان طلبہ نے قائم کیا تھا جو بیرونی ممالک کی اسلامی یونی ورسٹیوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس محاذ نے ۱۹۶۸ میں نور میسوری اور سلامت ہاشم کی زیر قیادت علانیہ کارروائیاں شروع کیں۔ اس طویل جدوجہد کے نتیجے میں' آج سے ۲۰ سال پہلے فلپائنی حکومت مذاکرات کی میز پر بیٹھنے پر مجبور ہو گئی اور اب تک وہ مذاکرات کے لیے آمادہ ہے۔ ان مذاکرات کے نتیجے میں اب تک تین صلح نامے طے پائے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے اب تک کسی ایک پر بھی عمل نہیں ہوا۔ ۱۹۷۶ میں سابق صدر مارکوس کے عہد میں ایک معاہدے کے تحت جنوبی فلپائن کے ۱۳ ضلعوں اور ۹ شہروں میں مسلمانوں کی خود مختار حکومت قائم کرنے کا اعلان کیا گیا مگر عمل درآمد نہ ہوا۔ اکینو کے دور حکومت میں (۱۹۸۶-۱۹۹۲) میں ۱۳ ضلعوں کے بجائے صرف چار ضلعوں میں مسلمانوں کی حکومت قائم کرنے کا کہا گیا مگر اس پر بھی عمل نہ ہوا۔ فروری ۱۹۹۴ کے اوائل میں صدر راموس اور نور میسوری کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت جنگی کارروائیوں کو روکنا اور جنوبی فلپائن کے لیے مجلس امن و ترقی کا قیام تھا مگر مسلمانوں کے لیے عملی طور پر کچھ بھی نہ ہوا۔ ان نام نہاد معاہدوں کا اصل مقصد مسلم فریق کو ٹالنا اور دھوکا دینا تھا۔ فلپائنی فریق نے مسلمانوں کے تتر بتر کرنے' عیسائی بستیاں بسانے' مسلمانوں کے رفاہی منصوبے ختم کرنے اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کے منصوبوں پر عمل درآمد مسلسل جاری رکھا۔

ایک اہم واقعہ ۱۹۷۷ میں مورو فرنٹ کی تقسیم اور سلامت ہاشم کا تنظیم "بانگسا برائے آزادی مورو" بنانا ہے۔ بعد میں اس کا نام مورو محاذ اسلامی رکھا گیا۔ علیحدگی ہوئی مگر عداوت اور باہمی لڑائی نہ ہوئی جیسا کہ فلپائنی حکام کو توقع تھی۔ مورو اسلامی کوششوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مارکوس کے عہد میں (۱۹۷۲ میں) ایک دہشت گرد فلپائنی تنظیم "ای لاجا" قائم ہوئی جس نے دو محاذوں پر مسلمانوں کے خلاف اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ اول: مسلم داعیوں اور سرگرم افراد کو قتل کرنا' دوم: مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لیے کوشش کرنا۔ اس تنظیم کو یورپی امریکی مسیحی تنظیموں کی حمایت و تائید حاصل ہے۔ یہ حکمرانوں کی سرپرستی

میں وسیع پیمانے پر کام کر رہی ہے۔ اس کی سرگرمیاں جنوب مشرقی ایشیا (انڈونیشیا، ملایشیا، تھائی لینڈ اور سنگاپور) کے علاقے میں جاری ہیں۔ اسے ویٹیکن اور عالمی مجلس کلیسا کی سرپرستی اور اشیرباد بھی حاصل ہے۔

صیہونی قوتیں بھی مورو مسلمانوں کے خلاف کام کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں۔ سپیشل اسرائیلی فورس نے فلپائنی سپیشل فورس کو تربیت دی ہے۔ اس تربیت یافتہ فورس کا نام ییلو آرمی (زرد فوج) ہے۔ اس فوج نے ضلع ڈی باؤ میں مسلمانوں کو قتل کرنے اور وہاں عیسائیوں کو آباد کرنے کا آپریشن کیا ہے جس کے نتیجے میں وہاں کی غالب مسلم اکثریت اب ۴۰ فی صد اقلیت میں بدل چکی ہے۔

**سلامت ہاشم کے انٹرویو کے اہم نکات**

فلپائن میں صدر اسٹرادا کی حکومت کے آغاز کے بعد سرکاری افواج اور سلامت ہاشم کے مورو اسلامک لبریشن فرنٹ کے درمیان کش مکش تیز ہو گئی لیکن ایک معرکے میں سرکاری افواج کی شکست کے بعد حکومت کی طرف سے مذاکرات کی پیش کش ہوئی اور فروری کے آخر میں سربراہی ملاقات طے پا گئی تھی لیکن تخریب کاری کی سازش کی اطلاع پر اسے مئی جون تک کے لیے موخر کر دیا گیا۔ کویت کے رسالے المجتمع (۱۹۹۹ نمبر ۱۳۴۱) کے لیے احمد عزالدین نے سلامت ہاشم سے ایک انٹرویو کیا ہے۔ اس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

مورو جہاد آزادی کے نتیجے میں مورو مسلمانوں کا تشخص بحال ہوا ہے، سرکاری کوششیں ناکام رہیں۔ اب مسلمان "فلپائنی مسلمان" کے بجائے بڑے فخر سے اپنے آپ کو "مورو مسلمان" کہلاتے ہیں حتیٰ کہ بہت سے مورو مسلمانوں نے فلپائنی نسبت ترک کر دی ہے البتہ کچھ کا محض سرکاری معاملات میں سہولت کی خاطر، فلپائنی قومیت سے ظاہری تعلق ہے۔

لڑائی سے پہلے حکومت مسلمانوں کو بہ نظر حقارت دیکھتی تھی کیوں کہ حکومت کے نزدیک مسلمان دوسرے یا تیسرے درجے کے شہری ہیں۔ مجاہدین کی پے در پے فتوحات کے بعد اب حکومت فلپائن بھی محاذ اسلامی اور مسلمانوں کے ساتھ باوقار انداز اپناتی ہے۔

مورو علاقے کے عیسائی باشندے، پہلے مسلمانوں کے جانی دشمن تھے مگر مسلمانوں کے حسن سلوک سے اب وہ محاذ کے حامی بن چکے ہیں۔ وہ بھی مسلمانوں کی طرح محاذ آزادی کو رضاکارانہ طور پر عطیات دیتے ہیں۔ بہت سے عیسائی، محاذ اسلامی میں شامل ہو چکے ہیں۔ کئی عیسائی کمپنیاں محاذ کو خطیر رقوم کے ذریعے مالی اعانت کرنے لگی ہیں۔ مسلمانوں نے اپنے بہت سے علاقے واگزار کر لیے ہیں اور ایک اسلامی مملکت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ شریعت نافذ کر دی گئی ہے۔ مسلمانوں نے پہلی مرتبہ نظام اسلامی کی حقیقت کا مشاہدہ کیا ہے۔ انھوں نے قاتل کو سزاے موت ملتے، بدکار اور شرابی کو کوڑے لگتے پہلی مرتبہ

دیکھا ہے۔ شراب نوشی اور تمباکو نوشی کی ممانعت ملاحظہ کی ہے۔ عورتوں اور مردوں کے اختلاط اور گانے بجانے کی ممانعت کا بچشم سر مشاہدہ کیا ہے۔ بہت سی خرافات و بدعات اور خلاف اسلام رسومات کو ختم کر دیا گیا ہے۔

علاقے میں واحد تنظیم مورو اسلامی محاذ آزادی (MILF) ہے' اس کے بعد ابوسیاف کی تحریک ہے جو بہت محدود ہے۔ البتہ مورو محاذ آزادی دو حصوں میں بٹ چکا ہے یعنی محاذ اسلامی اور محاذ وطن۔ دونوں میں محاذ آرائی کی کیفیت نہیں پائی جاتی بلکہ اچھے تعلقات ہیں۔ اور نور میسوری (صدر محاذ وطن) کئی معاملات میں تعاون کر رہے ہیں۔

نور میسوری نے ۲۱ سال کے طویل عرصے میں کئی بار حکومت سے مذاکرات کیے۔ انھوں نے حکومتی شرائط پر آئین میں رہتے ہوئے مذاکرات کیے اور بہت زیادہ امیدیں وابستہ کر لیں۔ مگر ہم مذاکرات کو ضمنی چیز سمجھتے ہیں۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ مورو مسلمانوں کو استصواب رائے کا حق دیا جائے کہ آیا انھیں مکمل آزادی چاہیے یا نہیں۔ ہم جہاد سے بھی غافل نہیں ہیں۔ مگر یہ انتہائی اقدام تمام پرامن ذرائع کے استعمال کے بعد اٹھائیں گے۔

حکومت فلپائن' امریکی امداد و تعاون حاصل کرنے کے لیے مورو اسلامی محاذ آزادی کے بارے میں یہ بے بنیاد الزام لگاتی رہتی ہے کہ عرب مجاہدین مورو مسلمانوں کے ساتھ مل کر مقامی عیسائیوں کو تہ تیغ کر رہے ہیں۔ اسے "عالمی دہشت گرد تنظیم" کا نام دیا جاتا ہے۔ حالانکہ فلپائن میں زیر تعلیم عرب طلبہ بے گناہ ہیں۔ بے گناہ عرب طلبہ کو گرفتار کر کے انھیں عدالتوں سے سزا دلوانے میں' اسرائیلی انٹیلی جنس کا بھی اہم کردار ہے۔

فلپائنی حکمران مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کو مٹانے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئے تھے۔ اب دعوت الی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کی تحریک نے مسلمانوں میں بیداری کی لہر پیدا کر دی ہے۔

مسلسل جدوجہد اور جہاد کے باوجود مورو مسلمان نئی نسل کی تعلیم و تربیت سے غافل نہیں۔ تعلیمی اداروں اور مساجد اسکول کے ذریعے باقاعدہ تعلیم و تربیت کا عمل جاری ہے۔

طویل جنگ کے نتیجے میں مینڈاناؤ کی معاشی حالت اور افرادی قوت متاثر ہوئی ہے مگر مورو مسلمان سادہ غذاؤں' سبزیوں اور جنگلی پھلوں پر گزارا کر لیتے ہیں۔ آزاد علاقوں کی حدود سے باہر کچھ تجارتی' زرعی اور صنعتی پراجیکٹ بھی ہیں۔ زرعی پیداوار بڑھانے پر توجہ دی جا رہی ہے۔ مورو مسلمانوں کے علاقے قدرتی پیداوار سے مالا مال ہیں۔ ملکی برآمدات میں' ۶۵ تا ۷۰ فی صد حصہ اسی علاقے کا ہوتا ہے۔ اس علاقے میں تیل کے وسیع ذخائر دریافت ہوئے ہیں۔ ماہرین کے اندازے کے مطابق یہ دنیا میں تیل کے

سب سے بڑے ذخیرے ہیں۔ حتیٰ کہ اس تیل کی مقدار برونائی کے تیل کی مقدار سے بھی زیادہ ہے۔

سب سے بڑا مسئلہ ایک لاکھ سے زائد مجاہدین کے اخراجات ہیں۔ جہاد کو مسلسل جاری رکھنے کے لیے مورو مسلمانوں نے بہترین منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔ ان منصوبوں کا پہلا حصہ ۱۹۸۱ سے شروع ہوا تھا جو ۲۰۰۰ میں مکمل ہو گا۔ دوسرا منصوبہ ۲۰۰۱ سے شروع ہو کر ۲۰۵۰ میں ختم ہو گا۔ ان منصوبوں کا مقصد اساسی جہاد کو جاری رکھنے کے لیے ذرائع اور وسائل مہیا کرنا ہے۔

طویل جنگ کے نتیجے میں ایک نڈر، بہادر، مومن نسل تیار ہو چکی ہے جن کی زندگی کا محور جہاد ہے۔ امید ہے کہ مورو مسلمانوں کے بارے میں عالم اسلام کا طرز عمل جلد ہی بدلے گا۔ مورو مسلمان ہر چیز سے بے پروا ہو کر اپنے زور بازو سے، صورت حال کو تبدیل کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ یقیناً حالات کا پانسہ ان کے حق میں ضرور پلٹے گا۔ ان شاء اللہ!

تازہ ترین صورت حال کے مطابق ابھی تک مذاکرات کا عمل از سرنو شروع نہیں ہو سکا۔ فلپائنی صدر اس سال کے آخر تک مذاکرات کے ذریعے مسئلے کو حل کرنے کے ارادے کا اظہار کر رہے ہیں لیکن مسئلہ اتنا آسان بھی نہیں ہے جتنا کہ سمجھا جا رہا ہے۔ کئی عشروں کی جنگ اور محاذ آرائی کے نتیجے میں حکومت اور مورو مسلمانوں میں بڑی دوریاں پائی جاتی ہیں۔ مسلمان دینی بنیادوں پر اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، جب کہ فلپائنی حکومت سیکولر بنیادوں پر مسئلے کا حل چاہتی ہے۔

## اردن میں اسلامی قوتوں کی کامیابی

سمیع الحق شیرپاؤ

اردن کے حالیہ بلدیاتی انتخابات میں اردن کی تحریک اسلامی الجبھۃ العمل الاسلامی (اسلامک ایکشن فرنٹ) نے شان دار کامیابی اور واضح اکثریت حاصل کی ہے۔

ملک کی تینوں بڑی میونسپل کارپوریشنوں اربد، الرصفیہ اور الزرقا سمیت دیگر بہت سی چھوٹی بلدیات میں اسلامک ایکشن فرنٹ سب سے بڑی جماعت کے طور پر ابھری ہے۔ وفاقی دارالحکومت عمان میں بھی تحریک اسلامی نے دو بلدیاتی نشستوں پر کامیابی حاصل کی ہے۔ ۸۰ فی صد سے زائد مقامات پر تحریک اسلامی کے کارکنوں نے سابق بلدیاتی صدور کو شکست دی ہے۔

بلدیہ زرقا کی صدارت کے لیے تحریک اسلامی کے امیدوار یاسر العمری نے سابق صدر مصطفیٰ القیاض کو ۱۲ ہزار ۸ سو ۳۰ ووٹ لے کر شکست دی ہے۔ اس بلدیہ کی نو کی نو نشستیں اسلامی قوتوں نے حاصل کی

ہیں۔ بلدیہ اربد کی ۱۱ نشستوں میں سے چھ اسلامک ایکشن فرنٹ نے، چار کتلۃ تعاون (تعاون گروپ) نے، جب کہ الاعتصام الاسلامیہ گروپ نے ایک نشست پر کامیابی حاصل کی ہے۔ اس بلدیہ کے لیے اسلامک فرنٹ کے امیدوار انجینیر نبیل الکوفحی نے سابق صدر بلدیہ عبدالرؤف تل کو ۱۰ ہزار ۳ سو ۲۸ ووٹ لے کر شکست دی ہے۔ انجینیر نبیل الکوفحی سابق نائب صدر بلدیہ احمد الکوفحی کے بیٹے ہیں۔ بلدیہ الوصیفہ میں بھی اسلامک ایکشن فرنٹ کے امیدوار فوزی حلیفہ نے سابق صدر موسیٰ علی السعد کو ۵ ہزار ۶ سو ۸۷ ووٹ لے کر شکست دی ہے۔ اس بلدیہ کی تمام نشستوں پر اسلامک فرنٹ کے امیدوار کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ اسلامک ایکشن فرنٹ نے مادبا، کرک، طفیلۃ اور سحاب کی بلدیہ اور عمان، خلیل اور ہاشمیہ کے علاقوں میں بھی بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔

بلدیاتی انتخابات میں ۴۳ خواتین نے بھی حصہ لیا جن میں صرف تین کامیاب ہوئی ہیں۔ ملک بھر میں ووٹ ڈالنے کی اوسطاً شرح ۵۹.۳ فی صد، جب کہ بعض دیہی علاقوں میں ۷۵.۶ فی صد رہی ہے۔

چیف الیکشن کمشنر توفیق کریشان نے کہا ہے کہ چونکہ ملک مالی بحران سے دوچار ہے اس لیے ممکن ہے کہ قریب قریب واقع بلدیات کو ایک دوسرے میں ضم کر دیا جائے۔ اس سے مالی بحران پر بھی قابو پایا جا سکے گا اور بلدیاتی خدمات کو بھی بہتر بنانے میں مدد ملے گی۔

تمام اپوزیشن جماعتوں نے انتخابی نتائج تسلیم کرتے ہوئے کہا ہے کہ انتخابات انتہائی پرامن اور شفاف فضا میں ہوئے ہیں۔ اپوزیشن جماعتوں کا کہنا ہے کہ انتخابات ہر قسم حکومتی مداخلت سے پاک رہے۔

اپوزیشن جماعتوں کی اعلیٰ سٹینڈنگ کمیٹی کے سربراہ ڈاکٹر عبداللطیف عربیات نے الشرق الاوسط کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ انتخابی نتائج نے ثابت کر دیا ہے کہ تحریک اسلامی اور اس کے امیدواران کو ان کے عوام کی بھرپور حمایت حاصل ہے، اور اسلامک ایکشن فرنٹ ہی اردن کی حقیقی نمایندہ تنظیم ہے (ماخوذ، روزنامہ الشرق الاوسط، ۱۷ جولائی ۱۹۹۹)۔

------------------------

# رسائل و مسائل

## آرمی میں ”رگڑا“ کی روایت

س: آرمی میں رگڑا (ragging) کی روایت پائی جاتی ہے۔ جب ہم سول سے آرمی میں جاتے ہیں تو سینئرز لائنوں میں کھڑا کر کے ہمیں بری طرح جھڑکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایکسرسائزز بھی ہوتی ہیں اور راتوں کو جگانا وغیرہ بھی۔ تین چار ماہ تک یہ سلسلہ چلتا ہے۔ ہماری کسی غلطی کے بغیر سینئرز کا اس طرح سے ہمیں جھڑکنا کیا جائز ہے؟

ان کے پاس اپنے اس رویے کی درج ذیل جواز یا وجوہات ہیں:

۱۔ یہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ یہ عام شہری ماحول میں جن برائیوں کے عادی ہیں ان کا یہاں اعادہ نہ کریں۔ یہ سمجھ جائیں کہ سِوَل (civil) کے بگڑے ہوئے ماحول سے یہ نکل آئے ہیں جہاں لاقانونیت تھی، مجرموں کو سزا نہ ملتی تھی، اور جرم کو جرم نہ سمجھا جاتا تھا۔ ان کا جو ذہن بنا ہوا تھا یعنی یہ کہ قانون کی پابندی کوئی نہیں کرنی، یہ مزاج یک دم بدل جائے اور سمجھ جائیں کہ یہ ماحول (آرمی کا) سول سے الگ ہے۔ یہاں غلطی پر سزا ملے گی۔

۲۔ تابع دار بن کر رہیں، سینئرز کا حکم مانیں۔ ان کے حکم کو مذاق میں نہ ٹالیں۔ ان کا مذاق نہ بنائیں۔ سینئرز کے ساتھ بدتمیزی نہ کریں۔ ان کو عزت دیں اور نظم و ضبط قائم رکھیں۔

۳۔ ایسی تربیت کے ذریعے آیندہ اچھی طرح کنٹرول کیا جاسکے۔

یہ بات اس حد تک تو درست ہے کہ اگر وہ آتے ہی ایسا نہ کرتے تو ہم واقعی سینئرز کے احکامات کو لاپرواہی سے لیتے، سینئرز کی تابع داری میں کوتاہی کرتے بلکہ ان کے ساتھ بدتمیزیاں کرتے اور نظم و ضبط کا ہرگز مظاہرہ نہ کرتے۔

کوئی نظام بھی شریعت سے بالاتر نہیں۔ کیا شرعی نقطۂ نظر سے یہ روایت درست ہے؟

ج: آپ کا سوال اولی الامر کی حدود اطاعت سے تعلق رکھتا ہے۔ اسلام کے بنیادی سیاسی اور معاشرتی اصولوں میں سے ایک اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس کے بعد صاحب اختیار افراد کے ان احکام کی پابندی بھی فرض ہے جو قرآن و سنت کے

مطابق ہوں۔ اگر اولی الامر کسی ایسی بات کا حکم دیں جو خالق کی معصیت یعنی اللہ یا رسول کی عدم اطاعت کی تعریف میں آتی ہو تو اس کی اطاعت قطعاً فرض نہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "کسی مخلوق کی کوئی اطاعت نہیں اگر خالق کی معصیت ہوتی ہو"۔

فوج میں بھرتی ہونے کے بعد نوجوانوں کو جس نظم و ضبط اور فرماں برداری کی تربیت دی جاتی ہے وہ خود آپ کے بقول ضروری ہے۔ اپنے خط کے آخر میں آپ نے خود یہ بات فرمائی ہے کہ غیر فوجی ماحول سے آنے والے افراد پر اگر وہ سختیاں اور کڑے حکم نہ لگائے جائیں جو فوج کا خاصہ ہیں تو صحیح معنوں میں نظم و نسق پیدا نہیں ہو سکتا۔

ہاں، اگر اس تربیت کے دوران کوئی ایسے کام کروائے جاتے ہوں جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد گرامی کے خلاف ہوں تو وہ چاہے سینئر ہوں یا جونیئر، آپ ان کے احکام ماننے کے پابند نہیں ہیں۔ یہ یاد رہے کہ ہر ادارے میں احکام کو نہ ماننے کا ایک طریقہ ہوتا ہے اور آپ کو بھی اس طریقے پر عمل کرنا ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہر نوجوان اپنی فہم کے مطابق جس بات کو صحیح سمجھتا ہو یا غلط سمجھتا ہو، اس پر ڈٹ جائے اور جس طرح چاہے خلاف ورزی شروع کر دے۔ اس لیے نظم کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے اختلاف کو مقررہ حدود میں رہتے ہوئے ظاہر کرنا ہوگا (ڈاکٹر انیس احمد)۔

## جعلی سند کی بنیاد پر امتحان میں کامیابی

س: دو سال قبل تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بیرون ملک آنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں آنے کے ایک ماہ کے بعد میرے بی اے کے امتحانات ہوئے جن میں، میں شریک نہ ہو سکا، لہٰذا میری جگہ میرے دوست نے امتحان دے دیا اور میں اچھے نمبروں سے کامیاب بھی ہو گیا۔ کامیاب ہونے کے کچھ عرصے بعد میں نے اپنے اس دوست کو کچھ رقم بھی ارسال کر دی، جس کا پہلے سے تعین نہیں کیا گیا تھا۔

یاد رہے کہ یہ سب کچھ اس وقت کیا گیا جب میں ملحدانہ فکر کا پیرو تھا۔ توحید اور رسالت کا منکر ہو گیا تھا، اور اسی کو حق جانتا تھا اور پھر تحریک اسلامی سے اپنا تعلق بھی ختم کر چکا تھا۔ اب، جب کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دوبارہ ایمان کی دولت سے نوازا ہے (الحمدللہ)، مجھے احساس جرم ملامت کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس سند کی بنیاد پر میں آگے اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا ہوں یا مجھے دوبارہ خود امتحان دینا ہوگا؟ میری اس پریشانی کو دور کر کے میری مدد فرمایئے۔

ج: آپ نے جس مشکل کا ذکر کیا ہے وہ محض آپ کی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ مختلف شکلوں میں ہمارے معاشرے کی جملہ خرابیوں میں سے ایک ہے۔ اس مسئلے پر گفتگو کرنے سے قبل اس بات پر قلبی مبارک باد قبول کریں کہ ایک غلطی کا ارتکاب کرنے کے بعد آپ کو شرمندگی ہوئی اور توبہ کرنے کے بعد آپ الحمدللہ اپنے معاملات کو دیانت داری کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

اگر ایک شخص دھوکا یا جعل سازی سے ایک امتحان پاس کر لیتا ہے لیکن اس کے بعد اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس نے غلطی کی، تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص سودی کاروبار کر رہا ہے اور اللہ اسے ہدایت دے دیتا ہے اور وہ تائب ہو کر جائز ذرائع سے اپنی روزی کا حصول شروع کر دیتا ہے۔ قرآن کریم کا حکم ہے کہ جو ہو چکا اسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نظرانداز فرمائے گا۔ یہی سبب ہے کہ دین اسلام میں توبہ و استغفار ایک ایسا طریقہ ہے جو انسان کی اصلاح اور آیندہ کی زندگی کو کامیاب بنانے کا نہایت موثر ذریعہ ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص یہ جاننے کے باوجود کہ ایک کام حرام ہے اور منع ہے، اس نیت سے اسے کرتا رہے کہ اس طرح اپنے لیے ذرائع پیدا کر لوں، اور جب خوب مادی وسائل جمع کر لے تو پھر توبہ کر کے تجارت اور دیگر جائز کام کرنے لگے تو یہ خود کو بھی اور اللہ تعالیٰ کو بھی دھوکا دینا ہے۔

دین کی بنیاد خلوص نیت پر ہے۔ گناہ اور غلطی کا سبب اگر بھول، نفس کا وسوسہ، وقتی طور پر بہکاوے میں آ جانا ہے، تو اس کی تلافی توبہ و استغفار اور پختہ عہد سے ہو سکتی ہے کہ آیندہ اس غلطی کا ارتکاب نہ ہو۔ لیکن منصوبہ بندی کر کے ایک غلطی کرنا پھر توبہ کر لینا، اخلاقی طور پر درست نہیں۔

آپ کے معاملے میں، جیسا کہ آپ نے لکھا ہے کہ ایک امتحان جعلی طور پر پاس کر لیا، اب اسے آپ لوٹا تو نہیں سکتے۔ اس لیے مناسب یہی ہو گا کہ توبۃ النصوح کے اصول کے پیش نظر آیندہ کے لیے اس بات پر قائم ہو جایئے کہ ہر کام صداقت و امانت سے کریں۔ کبھی جعل سازی کی طرف مڑ کر نہ دیکھیں اور علمی اور عملی طور پر اپنے مضمون میں نہ صرف کمال بلکہ کمال تقویٰ اختیار کریں۔ آپ کی نیکی اس برائی کو مٹا دے گی جو ماضی میں آپ سے سرزد ہوئی ان شاء اللہ (ا-ا)۔

## میاں بیوی کے مزاج کا فرق

سوال: ہر انسان کے اندر کچھ کمزوریاں اور خامیاں ایک بشری تقاضا ہے۔ کچھ عادات و اطوار پر قابو پانے پر انسان مکلف نہیں ہوتا مثلاً غصہ، کم گوئی، حساس یا بے حس طبیعت، بدمزاجی، جلد بازی یا سست روی وغیرہ۔ اس ضمن میں میرا سوال یہ ہے کہ وہ خامیاں یا کمزوریاں جس کا ایک فرد مکلف نہیں اور اس کی وجہ سے اس کی ازدواجی زندگی میں اس کی شریک حیات کو صدمہ یا

تکلیف پہنچتی ہے تو دنیا اور آخرت میں اس شخص کے مواخذے کی کیا صورت ہو گی؟

جواب: قرآن کریم نے انسان کو تخلیق کے اعتبار سے "احسن تقویم" سے تعبیر کیا ہے یعنی وہ بہترین شکل و فطرت کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے اندر حلم، رواداری، اخوت، محبت، بہادری اور غیرت بھی پائی جاتی ہے اور جلد بازی، جہل، سستی اور بدمزاجی بھی، لیکن چونکہ اصلاً وہ بہترین قوام سے بنا ہے، اس میں نیکی، اچھائی اور بھلائی بنیادی خمیر کی حیثیت رکھتی ہے۔ نفس، شیطان، ماحول، لالچ غرض کسی بھی محرک کی بنا پر وہ اپنی نیکی اور بھلائی کو دبا کر اور بہکانے میں آ کر غلطی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے اندر کا انسان، وہ دل جسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "مفتی" سے تعبیر کیا ہے، اسے بار بار متوجہ کرتا ہے کہ تم غلطی پر ہو۔ اب بھی اصلاح کر لو اور دوبارہ بھلائی اور نیکی کی طرف آ جاؤ۔ اگر وہ اس پکار کو سن لیتا ہے تو دنیا و آخرت میں کامیاب و کامران ہو جاتا ہے ورنہ خسارے میں رہتا ہے۔

آپ نے سوال کیا ہے کہ اگر ایک شوہر سے اس کی بیوی کو اس کے تنگ مزاج ہونے، درشت گوئی، بے حسی یا کسی سبب سے تکلیف پہنچتی ہے تو اس دنیا اور آخرت میں اس کے لیے کیا کیا جائے؟

قرآن و حدیث نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ شوہر، بیوی کے ساتھ معروف، بھلائی، اچھائی، عمدہ طرز عمل، محبت و مودت اور احترام و نرمی کا طرز عمل اختیار کرے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار بیوی کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا ہے حتیٰ کہ خطبہ حجۃ الوداع میں بھی اس طرف متوجہ فرمایا۔ آپ کے سوال میں دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر ایک شخص فی الواقع انتہائی نرم، صابر، محبت کرنے والا، خیال کرنے والا ہے تو مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ مسئلہ اسی وقت پیدا ہو گا جب وہ بجائے اللہ اور اس کے رسول کے اپنے مزاج کو، غصے کو، جلد بازی کو، اپنا خدا اور رہنما بنا لے۔ اور یہی وہ موقع ہو گا جب اسے غصہ کی باگ کھینچ کر رکھنی ہو گی، اپنے پر قابو رکھنا ہو گا اور اگر انسانی کمزوری کی بنا پر وہ کوئی سخت بات کہہ بیٹھے تو فوراً بیوی سے معذرت کر کے آیندہ اس طرز عمل سے ممکن طور پر بچنا ہو گا۔ یہ کہہ کر اپنی غلطی کو درست قرار نہیں دیا جا سکتا ہے کہ آخر انسان ہوں، کمزور ہوں وغیرہ وغیرہ۔

انھیں یہ اصلاح اور اپنے اوپر قابو اس دنیا ہی میں حاصل کرنا ہو گا تاکہ گھریلو ماحول بہتر ہو اور بیوی کے ساتھ ناانصافی اور ظلم نہ ہونے پائے۔ رہا معاملہ آخرت کا، تو قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ اگر ایک شخص ظالم ہے اور بیوی مظلوم ہے تو اللہ تعالیٰ مظلوم کو نہ صرف اس دنیا میں اجر دیں گے بلکہ آخرت میں ظالم سے نجات دلا کر ایسے فرد کا ساتھ دیں گے جو ان تمام کیے گئے مظالم کے مقابلے میں اسے سکون، چین اور بھلائی دے سکے۔ اسی لیے قرآن کریم نے "زوج" کی اصطلاح استعمال فرمائی ہے یعنی مظلوم خواتین کے لیے ایسے شوہر جو آخرت میں اللہ کے کیے ہوئے وعدوں کو عملاً کر کے دکھا سکیں، اور ایسے ہی مظلوم

شوہروں کے لیے ایسی بیویاں جو مطہرات ہوں گی تاکہ وہ آخرت میں بھی مظلوم نہ رہیں۔

میرے خیال میں معاملے کو آخرت تک موخر کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اگر آپ کو احساس ہے کہ آپ بعض اوقات یا اکثر اوقات اپنی بیوی کو تکلیف پہنچاتے ہیں تو فوری طور پر اس کی اصلاح یہاں کر لیجیے تاکہ آپ اس دنیا میں بھی اس ہدایت قرآنی پر عمل کر سکیں جو شوہر اور بیوی کے لیے دی گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے لباس ہوں، عزت و احترام و تحفظ میں ایک دوسرے کی مثال ہوں بلکہ یہاں پر بھلائی کے رویے کے نتیجے میں ان شاء اللہ آخرت میں بھی مضبوط رشتے میں منسلک ہو سکیں (ا - ا)۔

## سودی ادارے میں ملازمت

س : میں چارٹرڈ اکاونٹنٹ بننے والا ہوں۔ اس کے بعد جس ادارے میں بھی ملازمت ملے گی، وہاں سود کا حساب کتاب رکھنا ہوگا۔ کیا یہ میرے لیے جائز ہوگا؟

ج : جہاں تک بنک کی ملازمت کا تعلق ہے، تو وہ ناجائز ہے لیکن دوسرے ادارے جن میں اصلاً سودی کاروبار نہیں ہوتا البتہ وہ بعض اوقات اپنے کاروبار کو چلانے کے لیے سودی قرضے بھی لیتے ہیں، ان کی ملازمت جائز ہے۔ اس لیے کہ اس ادارے کا اصل کاروبار تو غیر سودی ہوتا ہے۔

جب تک نظام میں تبدیلی نہیں آتی اس وقت تک اس طرح کی مجبوریوں کا لحاظ رکھا جائے گا۔ واللہ اعلم! (مولانا عبدالمالک)۔

---

# کتاب نما

**شیخ سرہند**، مرتب: جمیل اطہر سرہندی۔ ناشر: ادارۂ اسلامیات، انار کلی، لاہور۔ صفحات: ۲۵۶۔ قیمت: ۹۰ روپے۔

شیخ احمدؒ سرہندی، برعظیم پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، افغانستان اور وسط ایشیا میں مجدد الف ثانیؒ (اسلامی تقویم کے دوسرے ہزارویں سال میں دین کی تجدید کرنے والے) کے لقب سے مشہور ہیں۔ وہ مسلمانوں کی علمی، فکری اور روحانی تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وہ ایک صوفی گھرانے میں پیدا ہوئے، اور چشتی، قادری سلسلے میں بیعت ہوئے۔ مگر پھر ان کی ملاقات خواجہ عبدالاحدؒ سے ہوئی، جن سے انھوں نے نقش بندی سلسلے میں بیعت اور خلافت پائی۔ صوفیا میں یہ واحد سلسلۂ رشد ہے جو سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وساطت سے حضور پرُنور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ نسبًا وہ فاروقی تھے اور ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ تصوف کو غیر اسلامی اعتقادات اور طریقوں سے پاک کرنا ہے۔ انھوں نے مداہنت کیش علما، حیات مستعار کے پرستار امرا، جاہ و اقتدار کے طلب گار حکام اور غفلت و کسل مندی کے شکار بدقسمت عوام کو بھی اس عزیمت کی طرف دعوت دی جو شعار اسلام کے غلبے کی طرف لے جاتی ہے۔

ہماری مسلم فکر کے بہت سے تذکرہ نگاروں نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے یہ اشارہ بھی کیا ہے کہ ساری اصلاحی کوششوں کے باوجود وہ بھی اس بخت نارسا کی ماری قوم کو تصوف کی افیون (''چنیا بیگم'') دے گئے۔ میرے خیال میں تاریخ کی حرکیات کو پوری طرح نہ سمجھ پانے سے اس طرح کے فکری مغالطے لاحق ہو جاتے ہیں۔ شیخ احمد سرہندی کا عہد سیاسی تحریکوں اور سیاسی جماعتوں سے ناآشنا تھا۔ انھوں نے اپنے عہد کے نمونے اور تمثال کے ذریعے ہی رشد و ہدایت اور ہمہ گیر تبدیلی کے لیے کام کیا، خواص اور عوام کے مختلف طبقوں تک بیعت و ارشاد کے صوفیانہ سلسلے سے پورا پورا کام لیا۔ اپنے سلسلے اور مریدوں کا جال، پورے ہندستان اور ملک سے باہر شمال مغرب میں پھیلا دیا، متعدد تصانیف کے علاوہ خط و کتابت کے وسیع سلسلے سے اپنی دعوت پھیلائی (ان کے مکتوبات کے تین دفتر ان کی زندگی ہی میں مرتب ہو کر اشاعت پذیر ہو گئے تھے) اور ہندستان کو ایک غیر مسلم ملک بن جانے سے بچا لیا۔ اسی حقیقت کے اعتراف میں علامہ اقبالؒ نے کہا تھا:

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں ۔۔۔۔ اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

بیسویں صدی میں یہ سعادت مولانا ابوالکلام آزادؒ کو نصیب ہوئی کہ انھوں نے اس عہد میں سب سے

پہلے مجددؒ کے تجدیدی کارنامے کی طرف توجہ دلائی۔ تقسیم ہند سے پہلے اور پاکستان کے قیام کے بعد مجدد کی تصانیف (خصوصاً مکتوبات) کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہوئی اور ان کے نظریات اور فکر و فلسفے پر مضامین اور مستقل تصانیف کا ایک غیر مختتم سلسلہ نظر آتا ہے۔ جمیل سرہندی کی مرتبہ' پیش نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

گہری عقیدت و محبت سے مرتب کی ہوئی اس خوب صورت کتاب میں مرتب کے اپنے سات مضامین کے علاوہ دیگر اہل قلم کے سولہ مضامین اور متعدد منظوم نقوش عقیدت شامل ہیں۔ اگرچہ فکر مجدد کو عام کرنے والی ہر کوشش لائق تحسین ہے' تاہم محسوس ہوتا ہے کہ فاضل مرتب نے نہایت عجلت میں مختلف اخبارات و رسائل سے مجددؒ پر شائع شدہ مضامین کو جمع کر کے کتابی صورت دے دی ہے (ان مضامین کے مصادر بھی نہیں دیے گئے۔ مرتب کا کہنا ہے کہ یہ مضامین' مجددؒ سے متعلق جلسوں میں پڑھے گئے)۔ دو تین مضامین کے علاوہ تقریباً سبھی مضامین میں ایک ہی طرح کا مواد بار بار پڑھنے میں آتا ہے' آپ کہاں پیدا ہوئے' کس کس سے بیعت کی' کون سے سفر کیے' جہانگیری دربار میں پیشی' قید و بند' حلقہ ارادت' سلسلۂ دعوت' وفات اور اثرات مابعد وغیرہ۔ چونکہ بیشتر مقالات کا انداز علمی و تحقیقی نہیں' بلکہ خوش عقیدتی کا ہے' اس لیے بہت سی کمزور روایتیں' کرامتوں کی داستانیں (اپنی مرضی سے قید ہوئے تھے' ص ۳۵' ۳۶) اور بادشاہ کی عقیدت کی ضعیف حکایتیں ("بادشاہ نے اپنی گستاخیوں پر ندامت کا اظہار کیا... حضرت سے شیفتگی کا یہ عالم ہوا کہ وہ انھیں ہمیشہ شاہی کیمپ میں ساتھ رکھتا تھا' یوں عظیم الشان مغل سلطنت کو خدا کے ایک درویش نے بے وام خرید لیا..." ص ۵۷) جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ مجددؒ کی اس بے باک فکر کو اجاگر کیا جائے' جو مال و دولت دنیا سے بے اعتنائی' نیز جاہ و حشم اور اقتدار کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ دنیا سے گریز کے بجائے اسے بدل دینے کے عزم' اور اس کے لیے قرآن و سنت نبویؐ کی حقیقی روح کو زندگی میں سمو لینے سے عبارت ہے۔ (پروفیسر عبدالقدیر سلیم)

**برصغیر میں مطالعۂ قرآن'** (فکر و نظر کا خصوصی شمارہ)' جنوری تا جون ۱۹۹۹' ادارہ تحقیقات اسلامی' اسلام آباد۔ صفحات: ۳۹۵۔ قیمت: ۱۰۰ روپے

ادارہ تحقیقات اسلامی' ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری کی زیر سرپرستی' علمی تحقیق کے میدان میں وقیع اور قابل قدر خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب وقتاً فوقتاً اہم موضوعات پر سیمی نار منعقد کرتے ہیں۔ ادارہ تحقیقات اسلامی نے ۲۸ اپریل تا یکم مئی ۱۹۹۷ کو برعظیم میں مطالعۂ قرآن کی کوششوں کا جائزہ لینے اور علمی حلقے کو اس سے متعارف کرانے کے لیے ایک چار روزہ سیمی نار منعقد کیا جس میں ۲۳ مقالے پڑھے گئے۔ ان میں سے سولہ مقالات زیر نظر شمارے میں پیش کیے گئے ہیں۔

باب اول (علوم القرآن) میں چھ مقالے ہیں۔ باب دوم (تفسیر اور مفسرین) میں آٹھ مقالے ہیں اور باب سوم (مخطوطات) میں دو مقالے ہیں۔ ہر مقالہ اپنے موضوع پر دلچسپ اور نادر معلومات فراہم کرتا ہے اور بعض تو جامعیت، ندرت اور گہرائی اور گیرائی میں مثالی مقام رکھتے ہیں۔ اختصار کے ساتھ ان مقالوں کا تعارف پیش خدمت ہے۔

ڈاکٹر عبدالرشید رحمت "قرآن فہمی کے اصول کے کام کا جائزہ" میں برعظیم کے نامور مفسرین کے تفسیری اصولوں کو زیر بحث لائے ہیں۔ بعض امور قابل توجہ ہیں۔ مقالے میں ترتیب، شخصیات، ان کے کام اور زمانے کے لحاظ سے نہیں ہے۔ وحید الدین خان اور ڈاکٹر اسرار احمد کا ذکر کسی بھی لحاظ سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے ذکر سے مقدم نہیں ہونا چاہیے۔ پھر اس بحث میں غلام احمد پرویز کا ذکر صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ پرویز کے اصول، قرآن فہمی کے اصول نہیں بلکہ تحریف قرآن کے اصول ہیں۔ کسی آدمی کے بارے میں اصل حقائق کو واضح نہ کرنا بلکہ ان پر پردہ ڈالنا تحقیق نہیں ہے۔ غلام احمد پرویز سنت کا منکر ہے لیکن ڈاکٹر عبدالرشید رحمت فرماتے ہیں: وہ سنت کو مآخذ اول نہیں مانتا۔ حالانکہ وہ سنت کا منکر ہے اور اطاعت رسولؐ کے اصول کا بھی منکر ہے۔ اس کے بعد "برعظیم میں مطالعہ قرآن: تراجم و تفاسیر" از ڈاکٹر اعجاز فاروق اکرم ہے جس میں مقالہ نگار نے ۱۱۷ھ میں محمد بن قاسمؒ کی آمد سے لے کر عہد حاضر تک عربی، فارسی، ہندی، سندھی، پشتو، پنجابی، بنگلہ، انگریزی اور دیگر علاقائی زبانوں (گجراتی، سنسکرت، ملیالم، مرہٹی، تامل، گورمکھی، براہوی، کناری، سرائکی) میں ہر نوع کے ترجمے اور تفسیر کا مکمل جائزہ پیش کیا ہے، تاہم بعض اہم مفسرین مثلاً مولانا حسین علی واں بچھراں، مولانا غلام اللہ خان راولپنڈی، مولانا قاضی شمس الدین گوجرانوالہ، مولانا قاضی نور محمد قلعہ دیدار سنگھ اور مولانا محمد طاہر پنج پیر مردان کا ذکر اس مقالے میں نہیں آسکا۔ یہ بڑی فروگذاشت ہے۔ اسی طرح گذشتہ عرصے میں روسی زبانوں اور فارسی زبان میں تفہیم القرآن کا ترجمہ پیش کر کے ایران، افغانستان اور وسط ایشیا کی ریاستوں میں پھیلایا گیا ہے، اس کا تذکرہ بھی رہ گیا ہے۔

ڈاکٹر فضل احمد نے برعظیم میں لغات القرآن کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔ سید عارف حسین نقوی نے شیعہ علما کی تفسیری خدمات کا تذکرہ کیا ہے۔ سیدہ شگفتہ خانم نے اعجاز قرآنی پر ایک مؤثر، جامع اور دلآویز مقالہ پیش کیا ہے۔ مضامین قرآن کے اشاروں پر عبدالعزیز عرفی نے بیش قیمت نکات پیش کیے ہیں۔

باب دوم میں، تفسیر بیان القرآن (مولانا اشرف علی تھانویؒ) کا جائزہ پروفیسر ڈاکٹر صلاح الدین ثانی نے، تفسیر مرادیہ (حضرت شاہ مراد اللہ سنبھلی) کا تعارف سید ابوالخیر کشفی نے، التفسیرات الاحمدیہ (ملاجیون) کا تعارف ڈاکٹر محمد طفیل نے اور تفہیم القرآن (سید ابوالاعلیٰ مودودی) کا جائزہ ڈاکٹر خالد علوی نے پیش کیا ہے۔ علوی صاحب کا جائزہ سیر حاصل اور جامع ہے اور موصوف نے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔

افتخار الحسن میاں نے تفسیر ضیاء القرآن کا' بعض معاصر تفاسیر (بیان القرآن' ترجمان القرآن' تفسیر ثنائی اور تفہیم القرآن) سے مقابلہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک ضیاء القرآن کا ترجمہ بامحاورہ ہے اور تحت اللفظ بھی۔ وہ اس بات کو ثابت کرنے میں خاصی حد تک کامیاب ہیں۔ البتہ ضیاء القرآن کے بعض تفسیری نکات محل نظر ہیں۔

خورشید احمد ندیم کا مضمون "برصغیر کی چند اہم تفاسیر: ایک تقابلی جائزہ" جامع اور موثر ہے اور حقیقت پسندانہ بھی لیکن غلام احمد پرویز کا تذکرہ یہاں بھی محل نظر ہے۔ کسی طرح بھی اس کا تذکرہ مفسرین میں صحیح نہیں ہے۔ "بلوچستان میں قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر" از پروفیسر انعام الحق کوثر' بہت مفید اور معلوماتی مقالہ ہے۔ ڈاکٹر احمد خان نے مبہمات القرآن کے موضوع پر چند اہم کتب کا تعارف کرایا ہے۔ مبہمات سے مراد وہ آیات ہیں جس کا مصداق متعین اور معلوم نہیں ہے۔ ڈاکٹر محمد شریف سیالوی نے مسعود جھنڈیر اسلامیہ لائبریری میلسی کا تعارف پیش کیا ہے اور وہاں کے عربی فارسی مخطوطات کا تعارف بھی کرایا ہے۔ مختصر یہ کہ اپنے موضوع پر یہ خاص نمبر ایک اچھی دستاویز ہے۔ (مولانا عبدالمالک)

**ہندوستانی مسلمان**' ایام گم گشتہ کے پچاس برس' ڈاکٹر راشد شاز۔ ترتیب و تدوین: کوثر فاطمہ۔ ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف مسلم امہ افیرز' علی گڑھ۔ صفحات: ۳۶۰۔ قیمت: ۲۵۰ روپے۔

بھارت کے مخصوص پیچیدہ اور دشوار سیاسی ماحول میں ۱۹۸۵ میں ایک "ادارہ برائے جملہ امور امت اسلامیہ" قائم کیا گیا تھا تاکہ مسلمانان ہند کی مشکلات اور پریشانیوں پر علمی انداز سے غوروفکر کرے اور انھیں ۱۹۴۷ کے بعد پیش آمدہ حالات کی پیدا شدہ مرعوبیت اور کمزور پوزیشن کے ماحول سے نکلنے کی راہ دکھلائے۔ اس پس منظر میں مصنف نے یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ گذشتہ نصف صدی میں امت اسلامیہ ہند جن اہداف کے حصول کے لیے کوشاں رہی ہے' وہ سرے سے اسلامی ایجنڈا تھا ہی نہیں بلکہ ہم دشمنوں کے ایجنڈے کو اپنا ایجنڈا سمجھ کر اور ان کے اہداف کو اپنا نصب العین بنا کر' ان کے حصول میں اپنی قوت کو ضائع کرتے رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ گذشتہ ۵۰ سالوں میں ہماری کوئی پیش قدمی تو کیا ہوتی' ہم اس حیثیت میں بھی باقی نہیں رہ گئے ہیں جہاں ہم آج سے ۵۰ سال پہلے موجود تھے۔

مصنف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد سے مسلمانان ہند ایک بدترین سیاسی محکومی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ سیکولر ڈیمو کریسی نے انھیں بحیثیت ملت پراگندہ' منتشر' بدحواس اور بے وزن کر کے رکھ دیا ہے۔ بھارت میں ۲۰ کروڑ مسلمان رہتے ہیں لیکن پارلیمنٹ میں مسلم ارکان کی تعداد ان کے عددی تناسب سے ہمیشہ ہی بہت کم ہوتی ہے۔ وہ ہندستان کی کل تعداد کا پانچواں حصہ ہیں۔ اس لحاظ سے ملکی پارلیمنٹ میں ان کا تناسب بھی اسی قدر ہونا چاہیے چنانچہ سرکاری ملازمتوں میں بھی ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی

ہے۔ مصنف نے اس کا حل متناسب نمایندگی کی بنیاد پر جداگانہ طریقۂ انتخاب تجویز کیا ہے اور اس ضمن میں ڈاکٹر راشد شاز کا نظریہ یہ ہے کہ موجودہ دستورِ ہند ترامیم اور تبدیلی کا متقاضی ہے۔

ایک مضمون میں مصنف نے ہندستان کے بے شمار فرقہ وارانہ فسادات کو قطعی طور پر ریاستی دہشت گردی سے تعبیر کیا ہے، جہاں غیر مسلم بلوائیوں کے ساتھ منظم پولیس اور پیراملٹری فورسز شامل ہوتی ہیں تاکہ مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ جانی و مالی نقصان پہنچایا جائے اور مقدمات بھی انھی کے خلاف قائم کیے جائیں۔ ان وارداتوں کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ مسلمان خوف اور بے بسی کی کیفیت میں مبتلا رہیں اور کچھ سوچنے اور سمجھنے کے قابل نہ رہیں۔

مصنف کا خیال ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کا سا نام رکھ کر کسی غیر اسلامی نظام کے غلبے کے لیے کوشاں ہیں، یا جو موجودہ سیکولر ڈیمو کریسی کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں، یا جو مسلمانوں کی جدوجہد سے کفار و مشرکین کو اس ملک کا اقتدار سونپنے کے لیے شب و روز متحرک ہیں تو یہ سب کے سب صریح شرک میں مبتلا ہیں۔ اس ملک کی تباہ حالی، وسائل کا اتلاف، معاشی ناہمواریاں، سماجی بے چینی اور ملک میں ہر لحہ جاری خانہ جنگی کی سی کیفیت آپ سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ایک بار پھر اس سرزمین کو آپ کی قیادت کی ضرورت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے پالیسی ساز، ملک کے بنیادی مسائل سے توجہ ہٹا کر، ملک کے وسائل کا ایک بڑا حصہ اسلحوں کی تیاری اور نیوکلیائی مادوں کے حصول میں ضائع کر رہے ہیں۔ ملک کے وسائل کو آخر کب تک ہم یوں تباہ و برباد ہوتا ہوا دیکھتے رہیں گے۔ اس ملک کے ۲۰ کروڑ اہل ایمان پر لازم ہے کہ وہ اس وطن عزیز کو ایک صالح قیادت دینے کے لیے اپنی تیاری تیز تر کر دیں۔ اس ضمن میں کتاب کے آخر میں ملی پارلیمنٹ کے اعلیٰ سطحی اجلاس (نئی دہلی، فروری ۱۹۹۸) میں جاری کردہ منشور دیا گیا ہے جس میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اس وقت تک انتخابات سے لاتعلق رہیں، ووٹ کا استعمال نہ کریں، جب تک ایک اسلامی سیاسی پارٹی کی تشکیل نہیں ہو جاتی اور ایک اسلامی متبادل سامنے نہیں آجاتا۔

مصنف کی تحریر میں ایک انقلابی دعوت کا پیغام ہے۔ کیا عجب کہ اس دعوت کے ذریعے امت میں رجوع الی القرآن کا داعیہ پیدا ہو اور وہ اپنے اندر سے اپنی جملہ کمزوریوں، ضعف ایمان، ضعف کردار، بے عملی، اجتماعی پراگندگی اور لایعنی رسوم کے خاتمے کے لیے کمربستہ ہو جائے۔ بہرحال یہ بے لاگ مضامین نہ صرف ہندستان میں بلکہ جملہ اسلامی دنیا کے لیے بھی غیر معمولی طور پر اہمیت کے حامل اور گہرے غور و فکر کے متقاضی ہیں۔ (انیس احمد اعظمی)

**طریقت کی حقیقت**، غلام علی۔ ناشر: البدر پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۴۰۴۔ قیمت: ۱۳۰ روپے۔

فاضل مصنف نے تصوف اور اس کے متعلقات کا مفصل تجزیہ اور محاکمہ کیا ہے۔ نو ابواب پر

مشتمل اس کتاب میں، مصنف نے تصوف کی تاریخ، اصلاح نفس اور شریعت، غیر اسلامی عقائد اور اعمال کے اسباب، برعظیم میں تبلیغ اسلام، رسم عرس اور قرآن کریم کی رو سے اولیاء اللہ جیسے عنوانات کے ضمن میں مفصل بحث کی ہے۔ "پیش لفظ" میں رقم طراز ہیں: "اس کتاب میں صوفیا اور فقہا کے باہمی اختلاف کا ذکر بھی ہے اور تصوف کی خرابیوں پر مشہور مذہبی شخصیات کی رائے بھی دی گئی ہے۔ گوشہ نشینی کی حمایت اور مخالفت کے دلائل بھی شامل کیے گئے ہیں" (ص ۱۲)۔

غلام علی صاحب نے تصوف کے بعض مسلمہ عقائد کو غیر اسلامی بتایا ہے۔ مثلاً: نظریۂ وحدت الوجود کو غیر اسلامی قرار دیتے ہوئے اسے اسلام کی جامعیت کے لیے ضرر رساں ٹھہرایا ہے (ص ۱۱)۔ اس باب میں وہ علامہ اقبالؒ سے متاثر ہیں، کیونکہ علامہ نے بھی امام ابن تیمیہؒ کے زیر اثر فصوص الحکم کے مفاہیم اور مکاشفات کو زندقہ اور الحاد سے تعبیر کیا تھا۔ اگرچہ بعد میں وہ شیخ اکبرؒ کی عظمت اور فضیلت کے قائل ہو گئے تھے (دیکھیے: تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، جاوید نامہ اور ارمغان حجاز)۔ ابتدا میں ابن عربیؒ کی مخالفت کی وجہ غالباً یہ تھی کہ علامہ موصوف نے شیخ کی تصانیف کا براہ راست مطالعہ نہیں کیا تھا۔ ۸/اگست ۱۹۳۳ کو پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ کے نام لکھتے ہیں: "حضرت شیخ اکبرؒ نے تعلیم حقیقت زمان کے متعلق کیا کہا تھا اور ائمہ متکلمین سے کہاں تک مختلف ہے؟--- "یہ تعلیم شیخ اکبرؒ کی کون کون سی کتب میں پائی جاتی ہے اور کہاں کہاں؟ اس کا مقصود یہ ہے کہ سوال اول کے جواب کی روشنی میں، خود بھی ان مقامات کا مطالعہ کر سکوں"۔

دراصل علامہ اقبالؒ نے ۱۹۰۸ کے قریب قریب امام ابن تیمیہؒ کے توسط سے شیخ کے بارے میں ایک رائے قائم کی اور ان کے نظریۂ وحدت الوجود کو ملت اسلامیہ کے زوال اور انحطاط کا باعث قرار دیا۔ حالانکہ ان کے مرشد مولانا رومؒ بھی اسی نظریے کے قائل اور مؤید تھے۔ علامہ اقبالؒ کی توانا اور زوردار شخصیت کے زیر اثر، بعد میں تصوف پر لکھنے والے اکثر و بیشتر مصنفین نظریۂ وحدت الوجود کو غیر اسلامی، عجمی، یونانی اور ہندی تہذیب کے افکار و نظریات کا ملغوبہ بتاتے رہے، حالانکہ شیخ اکبرؒ نہ تو اتحاد کے قائل تھے اور نہ حلول کے، بلکہ ان کے افکار تشبیہ اور تنزیہ کے معاملات سے بھی پاک اور منزہ ہیں۔ فتوحات مکیہ کی ابتدا میں انھوں نے لکھا ہے کہ: "خدا خواہ کتنا نزول فرمائے، خدا ہے، بندہ خواہ کتنا عروج پا لے، بندہ ہے" (فتوحات مکیہ، جلد اول، مترجم: صائم چشتی، علی برادران، فیصل آباد، ص ۱۷)۔

شیخ اکبرؒ وحدت الوجود کے سب سے بڑے شیخ اور پرچارک بھی تھے۔ یہ نظریہ عجمی تصورات کا مجموعہ نہیں، بلکہ عین اسلامی ہے۔ اسے نہ تو ایرانی "ہمہ اوست" سے کچھ علاقہ ہے اور نہ انگریزی Pantheism سے۔ یہ تصور ہندی افکار (حلول اور اتحاد) سے بھی الگ اپنی پہچان رکھتا ہے اور یونانی تصور احدیت (Monoism) سے بھی اسے کوئی نسبت نہیں۔ پیش نظر کتاب میں وحدت الوجود کے ضمن میں

حلول و اتحاد اور ہمہ اوست واحدیت کے تصورات میں خط تفاوت نہیں کھینچا گیا اور ان تمام اصطلاحات کو مترادفات کے طور پر برتا گیا ہے' جو غلط اور ناانصافی پر مبنی ہے۔ کتاب کے اکثر مقامات پر اختلاف رائے کی گنجایش موجود ہے' لیکن یہاں تفصیل کا موقع نہیں۔

کتاب لائق مطالعہ ہے۔ مصنف نے بڑی محنت سے اسے ترتیب دیا ہے۔ ان کا انداز تحریر استدلالی اور ان کا رویہ علمی ہے۔ کتاب میں کہیں بھی جذباتیت کا شائبہ نہیں پایا جاتا اور یہی کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ تصوف کے حق یا مخالفت میں' خاصا لوازمہ اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے۔ (عبدالعزیز ساحر)

**ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے خطوط**' مرتبہ عبدالعزیز ساحر۔ ناشر: حسنین پبلی کیشنز' ۱۱۔ ندیم پارک' گلشن راوی' لاہور۔ صفحات: ۲۴۰۔ قیمت: ۲۵۰ روپے۔

بیسویں صدی میں مسلمانوں کے ہاں تجدد کی لہر بڑی قوت سے اٹھی' لیکن ان میں کئی متجددین کو اللہ تعالیٰ نے نور ہدایت عطا کیا' اور وہ اپنی سابقہ سوچ سے رجوع کر گئے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق (۲۶ اکتوبر ۱۹۰۱ء۔ ۱۲ مارچ ۱۹۸۵ء) ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔

ڈاکٹر برق نے دین اسلام کے حوالے سے تشکیک و ریب پر مبنی کتب لکھ کر کچے ذہن کے کئی نوجوانوں کو دین سے برگشتہ کیا' لیکن جب انھیں اپنے موقف کی غلطی معلوم ہوئی تو انھوں نے رجوع کر لیا۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں: "کسی وقت میرے عقائد میں کجی رہی.... کیا بعد از توبہ بھی پچھلے گناہ معاف نہیں ہوتے؟" (ص ۴۰)۔ اور یہ کہ: "اللہ کی ہستی سے انکار کوئی گدھا ہی کر سکتا ہے" (ص ۴۷)۔ اور یہ کہ: "۱۹۵۲ء کے بعد میں نے حدیث کے متعلق اپنا موقف بدل لیا تھا-- [اب] میرے عقائد وہی ہیں' جو اہل سنت کے ہیں" (ص ۳۰)۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ان کے دور کج روی کی تخلیقات کو بعض ناشرین ابھی تک شائع کر رہے ہیں (حالانکہ اس کا کوئی جواز نہیں ہے)۔ ظاہر ہے کہ اس فعل کی جواب دہی ناشر حضرات کو آخرت میں کرنی ہو گی۔

نوجوان محقق عبدالعزیز ساحر نے برق مرحوم کے خطوط بڑی محنت سے جمع کر کے مرتب کیے ہیں۔ خطوط کے مکتوب الیہم کا تعارف بھی شامل کتاب ہے اور خط کے مندرجات میں جو امور وضاحت طلب تھے' ان کی تفصیلات (ص ۱۵۰ - ۲۰۶) کو تحقیقی ذوق کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

ابتدا میں برق مرحوم کا سوانحی خاکہ دیا گیا ہے (مع ان کی تصانیف کے)۔ پھر ان کے افکار و نظریات کا ایک مطالعہ و جائزہ ہے' اور آخر میں برق کی دست نوشت تحریروں کے عکس بھی شامل ہیں۔

یہ کتاب ترتیب و تدوین کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ (سلیم منصور خالد)

--------------------

# مدیر کے نام

**ابوالحسین ' راولپنڈی**

"شیخ عبدالعزیز بن باز" (جولائی ۹۹) میں اگر مرحوم سے مولانا مودودیؒ کی ملاقاتوں (نومبر۱۹۵۹) کا ذکر و احوال بیان کر دیا جاتا تو مضمون کی رونق دوبالا ہو جاتی۔ محمد عاصم الحداد نے اس کا تذکرہ اپنی کتاب سفرنامہ ارض القرآن میں کیا ہے۔ "مغرب کے بعد نجد کے مشہور عالم شیخ عبدالعزیز بن باز چند اصحاب کے ساتھ تشریف لائے۔ شیخ بن باز نے پیش قدمی فرمائی اور خود ہی ملاقات کے لیے تشریف لے آئے.... گو اس سے پہلے شیخ بن باز' مولانا مرحوم کے کارناموں--- ان لوگوں کے بقول' جہاد--- سے واقف تھے لیکن دونوں کے درمیان کبھی ملاقات یا مراسلت کا سلسلہ نہ رہا تھا۔ سلام و دعا کے بعد بار بار مولانا مرحوم سے خیریت دریافت فرماتے رہے۔ پھر شیخ بن باز ہمیں اپنے مکان پر لے آئے جو قدیم ریاض ہی کی ایک گلی میں واقع ہے۔ وہاں ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کا حلقہ لگا ہوا تھا۔ مجلس نہایت سادہ اور زمین پر قالین کے فرش کی تھی۔ اس کے بعد مولانا مرحوم نے شیخ بن باز کی خدمت میں اپنی چار عربی کتابیں رسالہ دینیات' اسلام کا نظام حیات' مسلمانوں کا ماضی و حال اور قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں پیش کیں"۔

**سمیرا یعقوب**

ترجمان القرآن کی باقاعدہ قاریہ ہوں۔ ترجمان میں شائع ہونے والے تمام مضامین بہت پسند ہیں۔ ان مضامین کی پسندیدگی کی اصل وجہ یہ ہے کہ کسی خاص مہینے میں ہی پڑھنے کے لیے نہیں ہوتے بلکہ جب بھی عرصے بعد انھیں پڑھا جائے تو اتنے ہی مفید اور دلچسپ ہوتے ہیں جتنے پہلے تھے۔ "اکیسویں صدی کے تقاضے" (جولائی ۹۹) ہارون الرشید صاحب کی بہت ہی بہترین اور معلوماتی تحریر ہے۔ مجھے یہ مضمون بے حد پسند آیا۔

**سعد الدین ' کورنگی ' کراچی**

ہارون الرشید صاحب کا مضمون بھی کیا تھا۔ بناوٹ' آرایش اور لفاظی گویا کہ "طویل تر گفت گو' قلیل تر درست گو"۔

**محمد خالد مسعود ' فیصل آباد**

میرا ایک مشاہدہ ہے کہ آپ کا رسالہ جتنا چھپتا ہے اور جتنا بکتا ہے' اتنا پڑھا نہیں جاتا۔ مجھ جیسے بے شمار خراب لوگ بھی رسالے کا سالانہ چندہ اس لیے دے دیتے ہیں کہ اس سے آدمی خود کو نیک نیک سا' بزرگ بزرگ اور بیبا بیبا سا لگتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو مطمئن کرتا ہے کہ دیکھو میں نے اس ادارے کی مدد کی ہے جو اشاعت کے لیے تبلیغی کام کر رہا ہے۔ لہٰذا میں ایک اچھا آدمی ہوں' نیک آدمی ہوں' جب کہ صورت حال یہ ہوتی ہے کہ جب اسے ہر ماہ رسالہ ملتا ہے تو وہ ورق گردانی کر کے اسے رکھ لیتا ہے۔ اور پھر وہ رکھا ہی رہتا ہے یا زیادہ سے زیادہ وہ ایک آدھ دلچسپ مضمون پڑھ لیتا ہے۔ میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ انداز تکلم اور انداز تحریر اگر متاثر کن اور دلچسپ ہو تو سامع اور قاری کہیں بھاگ نہیں سکتے۔ یقیناً آپ کے رسالے میں ایک دو مضمون ایسے ضرور ہوتے ہیں جن سے بھاگا نہیں جا سکتا مگر کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ شروع کی چند سطریں ہی دوڑ لگوا دیتی ہیں۔ آج کل سورج گرہن نے پوری دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کی ہوئی ہے۔ مغرب والے اسے ایک تقریب سی سمجھ کر منا رہے ہیں۔ پوری دنیا میں ایک پکنک کا سماں بندھ رہا ہے۔ ایسے میں مذہب اسلام کے حوالے سے سورج گرہن یا چاند گرہن پر ایک دلچسپ معلوماتی مضمون شائع کریں تو بہتوں کا بھلا ہو گا۔

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵۔اے ذیلدار پارک 'اچھرہ' لاہور سے شائع کیا

# زخمی ،معذور اور بیمار مجاہدین ،مہاجرین کا ادارہ

# کشمیر سرجیکل ہسپتال

## زیر اہتمام : پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن

- اکتوبر 1990 سے جون 1999ء تک 360000 ہزار مریضوں کا مفت اور مکمل علاج کیا گیا۔
- 1000 سے زائد افراد کو فراست بائٹ سے نجات دلا کر معذور ہونے سے بچالیا گیا۔ (الحمد للہ)
- تمام مہاجرین اور عسکری تنظیموں کے مجاہدین کا مکمل اور مفت علاج کیا جارہا ہے
- کشمیر سرجیکل ہسپتال کے تحت متحدہ جہاد کونسل میں شامل تمام تنظیموں کے کیمپوں 60 فرسٹ ایڈ سنٹر کام کر رہے ہیں
- روزانہ 250 سے 350 مریضوں کو مفت طبی امداد فراہم کی جاتی ہے
- ہسپتال کے زیر اہتمام مہاجرین کے کیمپوں میں چار مستقل ڈسپنسریاں اور چار ایمبولینس گاڑیاں ہمہ وقت مصروف کار ہیں جبکہ کیمپوں میں چار نئی ڈسپنسریاں قائم کی جارہی ہیں۔
- مظفر آباد اور کوٹلی میں چار ایمبولنس گاڑیاں ہمہ وقت مصروف کار ہیں
- دو نئے وارڈ کی تعمیر جاری ہے
- معذور مجاہدین اور مہاجرین کو 800 سے زائد مصنوعی اعضاء لگائے گئے

**ہسپتال کے لئے تعاون صرف کراس چیک/ ڈرافٹ کی صورت میں ارسال کریں۔ ٹریولر چیک کی صورت میں رقم ارسال نہ کریں۔**

## کیا آپ کا بھی اس میں کوئی حصہ ہے



## خوش نصیب ہے جو گھر بیٹھے

★ غزوہ ہند میں شریک ہے ★ اپنی ملت کی زخمی شہ رگ سے بہتے لہو پر مرہم رکھ رہا ہے ★ زخمی و معذور مجاہدین و مہاجرین کی خدمت اور عیادت کا ثواب حاصل کر رہا ہے ★ عظیم ملی فریضے کی ادائیگی کر رہا ہے

اور رسول ﷺ سے جنت کی بشارت پا رہا ہے (الحدیث) اور جو اس سے محروم ہے وہ یقیناً بہت ہی محروم ہے

آپ نقد عطیات کے علاوہ ادویات کی صورت میں بھی مدد کر سکتے ہیں

**تعاون کے لیے**

ڈاکٹر محمود حسین کیانی (میڈیکل سپرنٹنڈنٹ)
کشمیر سرجیکل ہسپتال پولٹری فارم روڈ مظفر آباد آزاد جموں کشمیر
فون: 058810-3700

**اکاؤنٹ نمبر 1128**
**بنک آف پنجاب**
**مظفر آباد آزاد کشمیر**



C .P.L. 236.
Phone : 7587916
7585590
Monthly TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE,

